اُستاذ سیّد قطب

اِسلام کی اِقتصادی پالیسی

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - لاہور - ڈھاکہ

اسلام کی اقتصادی پالیسی

سید قطب شہید

ترجمہ

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ - لاہور (مغربی پاکستان)

شاخ: ۱۶- بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عرضِ ناشر

یہ کتابچہ سیّد قطب شہید کی معرکہ آرا تالیف "اسلام میں عدل اجتماعی" —— (العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام) کا ایک باب ہے، جس میں اسلام کی اقتصادی پالیسی پر نہایت جامع اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو حضرات مختصر وقت میں اسلام کی اقتصادی پالیسی سمجھنا چاہتے ہیں، اُن کے لیے یہ کتابچہ نہایت کارآمد اور مفید ثابت ہوگا۔

جو حضرات اسلام کے معاشی نظام کو تفصیلی طور پر سمجھنا چاہتے ہیں اور موجودہ معاشی مسائل کا حل اسلام کی روشنی میں جاننا چاہتے ہیں، انھیں ہم مؤلف موصوف کی اصل کتاب "اسلام میں عدل اجتماعی"، کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیں گے۔ جس میں اسلام کے معاشی نظام کے ہر پہلو کو شرح و بسط سے پیش کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے وہ تمام الجھنیں دُور ہو جائیں گی، جو جدید معاشی نظریات نے اسلام اور اس کے معاشی نظریہ کے بارے میں پیدا کر رکھی ہیں۔

نیازمند

اخلاق حسین

لاہور، ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۸۸ھ
مطابق ۴ مارچ ۱۹۶۹ء

اِسلام کی اِقتصادی پالیسی

آج کل اجتماعی عدل پر اظہارِ خیال کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی پالیسی کو دی جاتی ہے اور اسی وجہ سے غالباً اکثر پڑھنے والوں نے ایسا محسوس کیا ہوگا کہ کتاب میں اس موضوع کو بہت مؤخر کر دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ کیونکہ اسلام میں جس چیز کو ہم اجتماعی عدل کہتے ہیں وہ اقتصادی پالیسی سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند تر چیز ہے، جیسا کہ ہم گزشتہ ابواب میں واضح بھی کر چکے ہیں۔ اِسی لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ مخصوص طور پر اسلام کی اقتصادی پالیسی کے بیان سے پہلے اس بنیادی اہمیت کے حامل مکمل فکر کو سامنے لائیں جو اس نظامِ عدل کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پھر ہم نے اس کے مزاج، اس کے ارکان اور اُن طریقوں کی تشریح کی جو اجتماعی عدل کے وسیع باب میں اسلام نے اختیار کر رکھے ہیں۔ اقتصاد کو مقدم رکھنا مادّی نظاموں کا خاصہ ہے جو معاشی قدروں کے ماسوٰی زندگی کی دوسری قدروں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

اسلام اقتصاد کے باب میں جو پالیسی اختیار کرتا ہے وہ اس کے جامع فکر اور بنیادی نظریہ کے عین مطابق ہے۔ اسلام اقتصادی پالیسی کے ضمن میں بھی پہلے اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ اللہ واحد کی بندگی کا اُصول قائم ہو۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ دولت کا استعمال اللہ کے قانون کے تابع ہو جائے۔ یہ قانون فرد اور جماعت دونوں کے مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے اس

سلسلہ میں ایک موزوں و مناسب درمیانی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نہ تو فرد کی کوئی حق تلفی ہوتی ہے نہ جماعت کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نہ تو فطرت کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے نہ زندگی کے حقیقی اصول و ضوابط یا اس کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔

اِس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے کے لیے اسلام اپنے وہی دو بنیادی طریقے اختیار کرتا ہے۔ یعنی قانونی ضابطہ بندی اور ہدایت و تلقین۔ قانون کے ذریعہ وہ ایسے عملی مقاصد حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ ایک صالح، ترقی پذیر سماج کی تعمیر کے لیے کافی ہیں، اور ہدایات و تلقین کے ذریعہ وہ حاجات کی غلامی سے بلند ہونے، زندگی کے بلند تر تصوّر کی طرف متوجہ ہونے اور بحیثیت مجموعی زندگی کو "آئیڈیل" کی حد تک بلند کر دینے جیسے اعلیٰ مقاصد کی طرف اقدام کرتا ہے۔ یہ مقاصد کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں کہ تمام لوگوں کا ہر طرح کے حالات میں ان تک پہنچ سکنا ممکن نہیں۔ البتہ وہ ترقی اور کمال کی راہیں ہمیشہ کھلی رکھتا ہے۔

مالی پالیسی پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے قبل ہم ایک ایسی مثال سامنے لائیں گے جس سے خود مال کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کو مال میں سے ایک واجب الوصول حق قرار دیا ہے جسے وہ لوگوں پر قانوناً لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کی عدم ادائیگی کی شکل میں اُس نے امام کو حدود قائم کرنے اور ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جو اس سے انکار کریں۔ مزید برآں اُس نے امام کو یہ حق بھی دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اس قدر ٹیکس وصول کرے جس سے ہر طرح کے ضرر کا ازالہ ہو سکے، تنگی دُور کی جا سکے اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مفادات و مصالح محفوظ کیے جا سکیں۔ یہ بھی ضرورت پڑنے پر زکوٰۃ ہی کی طرح ایک حق ہو جاتا ہے، جس کی بابت فیصلہ کا انحصار اسلامی نظام کے عام اصولوں، اُمت کے مصالح اور امام کی انصاف پسندی اور

دیانتداری پر ہے۔

معاملہ کا قانونی پہلو تو اسی حد تک تھا، لیکن ہدایت و تلقین کے ذریعہ لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے سارے ہی مال سے دست بردار ہو جائیں اور اُسے کُل کا کُل اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً نحو اُحدٍ وانا معہٗ فقال: "یا اباذر!" فقلت لبیک یا رسول اللہ۔ فقال: الاکثرون ھم الاقلّون یوم القیامۃ الّامن قال کذا وکذا۔ عن یمینہ وشمالہ وقدامہ وخلفہ۔ وقیل ماھم۔ ثم قال: "یا اباذر!" فقلت: نعم یا رسول اللہ! بابی انت وامّی۔ قال: مایسُرُّنی ان لی مثل اُحدٍ، انفقہ فی سبیل اللہ اُمرت واترک منہ قیراطین۔ قلت: او قنطارین یا رسول اللہ! قال: "بل قیراطین" ثم قال: "یا اباذر! انت ترید الاکثر وانا ارید الاقل"۔

(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

"ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کی طرف تشریف لے چلے۔ مَیں بھی آپؐ کے ساتھ تھا۔ آپؐ نے فرمایا: "ابوذر!" مَیں نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ لبیک۔" آپؐ نے فرمایا: "آج جو لوگ زیادہ رکھتے ہیں کل قیامت کے دن وہی مفلس ہوں گے بجز ان کے جو ایسا کریں — آپؐ نے اپنے ہاتھ دائیں بائیں اور سامنے پیچھے چلاتے ہوئے کہا — اور ایسے لوگ کم ہی ہوں گے۔" پھر

آپؐ نے فرمایا: "ابوذر!" مَیں نے عرض کیا "ہاں، اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان (ارشاد ہو)۔ آپؐ نے فرمایا: "مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد جتنی دولت ہو اور مَیں اُسے راہِ خدا میں خرچ بھی کرتا رہوں لیکن مروں تو اس میں دو قیراط (بلا خرچ کیے ہی) چھوڑ جاؤں۔" مَیں نے عرض کیا: "رسولِ خدا آپ کی مُراد کیا دو قنطار سے ہے؟" آپؐ نے فرمایا "نہیں نہیں دو قیراط۔" پھر آپؐ بولے: "ابوذر! تم زیادہ کی طرف جاتے ہو اور مَیں کم کی طرف۔"

وہ تھی قانون سازی اور یہ ہے ہدایت و تلقین! اور یہ دونوں مِل کر ہی اقتصادی پالیسی کی تشکیل کرتی ہیں۔ اسلام کی تمام پالیسیوں کا یہی حال ہے۔

آئیے اب ہم تفصیلات میں داخل ہوں۔

انفرادی ملکیّت

انفرادی ملکیّت کا حق

اسلام دولت کی انفرادی ملکیّت کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔۔ حصولِ ملکیّت کی اُن مخصوص شکلوں کے ساتھ جن کو قانون جائز قرار دیتا ہو۔۔ اِن شکلوں کا بیان آگے آتا ہے۔ اور ایسی انفرادی ملکیّت کو اس نے اپنے نظام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ پھر وہ اس حق کو تسلیم کرنے پر مترتب ہونے والے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ مثلاً حق دار کے حق کی حفاظت اور اُسے چوری ڈاکہ، لُوٹ مار اور اُچکّے پن وغیرہ کی تمام شکلوں سے محفوظ رکھنا۔ ساتھ ہی وہ اس بات کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ بغیر کسی اجتماعی ضرورت کے اور بغیر پورا معاوضہ دیئے ہوئے کسی کی ملکیّت چھین لی جائے۔ اِس تحفّظ کی عملی طور پر ضمانت وہ دست اندازی کی اِن تمام شکلوں پر سخت سزائیں مقرر کر کے دیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اصلاحی ہدایات و تلقینات اپنی جگہ پر ہیں جن کے ذریعہ وہ نفس کو ان چیزوں کی طرف

پکنے سے روکتا ہے جو اس کے اپنے پاس نہیں بلکہ دوسروں کی مِلک ہیں۔
اسلام نے اپنے ذاتی ملکیت کے دوسرے لوازم بھی تسلیم کیے ہیں۔ یعنی اپنے مال میں تجارت، اجارہ، رہن، ہبہ اور وصیت کے ذریعہ تصرف کی ان تمام شکلوں کا پورا پورا حق جو حلال ہوں اور ایسے تصرفات کے لیے اسلام نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر ہوں۔

اسلام میں اِس صریح اور واضح حق کے تسلیم کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ بات بھی شبہ سے بالا ہے کہ یہ حق اسلامی طرزِ زندگی کا ایک بنیادی اصول اور اسلام کے اقتصادی نظام کی اساس ہے۔ یہ ایسا بنیادی اُصول ہے جس کی خلاف ورزی صرف ضرورت کی صورت میں ضرورت کی حد تک ہی کی جا سکتی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (النساء: ۳۲)

"مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں، اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اِس میں سے جو وہ خود کمائیں۔"

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ (النساء: ۲)

"یتیموں کا مال اُن کے حوالہ کر دو اور بُری چیز کو اچھی چیز سے بدل نہ لو۔"

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۚ (الکہف: ۸۲)

"رہی دیوار تو وہ اُسی شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اُس

کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔ ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ پس تیرے رب کی مشیّت یہ ہوئی کہ وہ دونوں لڑکے پختہ عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ برآمد کر لیں۔ یہ تیرے رب کی طرف سے کرم فرمائی تھی۔"

حدیث میں آیا ہے کہ:

من قتل دون ماله فهو شهيد (بخاری و مسلم)

"جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔"

چوری کی سخت سزا، اس حق کے احترام اور اس پر دست درازی کی ممانعت کی کھلی دلیل ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْآ اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ط (المائدہ: ۳۸)

"چوری کرنے والے مرد یا عورت کا حکم یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اس جرم کے بدلے جس کے وہ مرتکب ہوئے، اللہ کی طرف سے سزا کے طور پر۔"

غصب کرنا حرام اور اس جرم کا مرتکب ملعون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

من ظلم من الارض شيئًا طوّقه من سبع ارضين - (بخاری و مسلم - یہ الفاظ بخاری کے ہیں)۔

"جو کسی دوسرے کی زمین کا تھوڑا سا حصّہ بھی غصب کرے گا ساتوں زمینوں کا طوق اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔"

من اقتطع مال امرئ مسلم بغير حقٍ لقي الله عزوجل وهو عليه غضبان - (استاذ احمد محمد شاکر کی مرتب کردہ مسند امام احمدؒ، حدیث نمبر ۳۹۴۶)

"جو شخص کسی مسلمان کا مال بلا استحقاق دبا بیٹھے وہ اللہ کے حضور اس

حال میں جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر بہت غضب ناک ہوں گے۔"

فرد کو جس طرح ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے اُسے ورثہ پانے اور وارث بنانے کا حق بھی حاصل ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ۔ (النساء: ۷)

"مردوں کا حصہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور اسی طرح عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے اِس ترکہ میں سے جو ماں باپ یا قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔"

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ج (النساء: ۱۱)

"اللہ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے، اولادِ نرینہ کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔"

يَسْتَفْتُونَكَ ط قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ط إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ج (النساء: ۱۷۶)

"لوگ آپؐ سے فتویٰ پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے کہ اللہ تم کو کلالہ کا حکم بتاتا ہے، اگر کوئی آدمی اِس حال میں مرے کہ اس کے لڑکا نہ ہو اور اس کی بہن زندہ ہو تو اس کو اس کے ترکہ کا نصف مل جائیگا۔"

انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا اور اس کا تحفظ محنت اور بدلہ کے درمیان عدل قائم کرنے کا کام کرتا ہے۔ اِس طور پر فطرت سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نفسِ انسانی میں راسخ میلانات کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں ——— وہ میلانات جن کی اسلام نظامِ اجتماعی کی تشکیل میں پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا

ہے۔ ساتھ ہی ایسا کرنا جماعتی مصالح سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ کیونکہ یہ فرد کو اِس بات پر اُبھارتا ہے کہ زندگی کی ترویج و ترقی کے لیے جو کچھ بھی اُس کے بس میں ہو کر گزرے۔

مزید برآں یہ افراد میں وہ آزادی اور عزتِ نفس پیدا کرتا ہے اور ان کی شخصیت کو اس انداز پر نشو و نما دیتا ہے کہ وہ اس دین کے علم بردار بن کر رہنے، مُنکر کی روک تھام کرنے اور حکمراں کا احتساب کرتے ہوئے اس کو نصیحت کرنے کے قابل ہو سکیں —— بغیر اس کے کہ اُنھیں اس بات کا اندیشہ لاحق رہے کہ ان کی روزی نہ چھن جائے، جیسا کہ روزی کے حاکم کے ہاتھوں میں رہنے سے لازم آتا ہے۔

چنانچہ فرد کی فطرت میں "خیر" کی طلب ودیعت کی گئی ہے:

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ۝ (العادیات: ۸)

"وہ خیر کی طلب میں بہت حریص واقع ہوا ہے۔"

اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ اس کی ملک ہو اس پر قبضہ کرنے اور انھیں اپنی مِلک میں باقی رکھنے پر حریص ہو۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْۤ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

"کہہ دیجیے کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو بھی ختم ہو جانے کے ڈر سے ہاتھ روک لیتے۔"

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ (النساء: ۱۲۸)

"دل تنگی کی طرف مائل ہو جایا کرتے ہیں۔"

اپنی اولاد سے محبت اور اپنی محنت کے ثمرات ان کو ورثہ میں منتقل کر جانے کی خواہش بھی بالکل فطری ہے۔ آدمی جو مال ان کے لیے بچا رکھتا ہے وہ محنت ہی ہے جسے مال کی صورت میں جمع کر کے رکھا گیا ہے۔ اور اپنی زندگی

میں اپنے آرام و آسائش کا ذریعہ بنانے کے بجائے اپنی اولاد کو ترجیح دیتے ہوئے ان کے لیے رکھ چھوڑا گیا ہے۔

اِن فطری میلانات کا ساتھ دینے اور ان کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ تاکہ انسان محنت اور پیدائشِ دولت کی مہم میں اپنی ہی ضروریات کی خاطر اور اپنے ہی ذوق و شوق کے تحت پورے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھے اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے، حالانکہ وہ کسی طرح بھی خود کو محنت کرنے پر مجبور نہ پاتا ہو، نہ بے دلی، ناپسندیدگی اور مایوسی کے جذبات اس کے پاس پھٹکیں۔ اس کی اس کدّ و کاوش کا حاصل بالآخر جماعت کے حصہ میں آئے گا۔ مزید برآں اسلام ایسے قواعد و ضوابط بھی ترتیب دیتا ہے جو اس کا فائدہ جماعت کو بہم پہنچانے کے علاوہ ان متوقع نقصانات کا بھی سدِباب کرتے ہیں جو فرد کی آزادیٔ مطلق اور اس کو عطا کردہ حقِ ملکیت کے نتیجہ میں سامنے آسکتے ہیں۔

یہ بات عدل کے اوّلین تقاضوں میں سے ہے کہ جہاں تک مفادِ جماعت کے لیے مضر نہ ہو اجتماعی نظام کو فرد کے میلانات و رجحانات سے ہم آہنگ اور اس کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے۔ فرد جماعت کی راہ میں جو قوتیں صرف کرتا ہے، جس طرح اپنا پسینہ بہاتا ہے اور اس کے لیے جو جسمانی اور ذہنی کدّ و کاوش کرتا رہتا ہے اس کے پیشِ نظر ایسا کرنا بالکل ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ عدل ہی اسلام کا اصل الاصول ہے۔ عدل اجتماعی کا قیام و بقا اِس طور پر ممکن نہیں کہ اس سلسلے کی قربانیوں کا سارا بار فرد ہی پر آن پڑے۔ اگر ہم درمیانی راہ چل کر اجتماعی عدل کو اس کی تمام صورتوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں تو لازماً ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر یکساں طور پر پڑے۔

کوئی بھی قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ معقول طبیعی محرکات و عوامل کو کچلنا فرد یا جماعت کے حق میں کچھ اچھا ثابت ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ

فطرتِ انسانی سے ایک بلاوجہ کی بدگمانی ہے جو قیامِ عدل کی واحد ممکن شکل بس
اسی کو قرار دیتی ہے کہ ان فطری میلانات کو دبا دیا جائے اور اُن کی راہ روک
کر کھڑے ہو جایا جائے۔ وہ خیالی نظریات جو حقیقتِ واقعہ سے کوئی بحث نہیں
کرتے صرف وہی یہ فرض کر سکتے ہیں کہ خارج، قانون اور سماجی نظم کا دباؤ ڈال کر
ایک آدھ پشت یا چند پشتوں میں ان محرکات کو یکسر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام
فطرت سے اس درجہ بدگمانی نہیں کرتا اور نہ ہی وہ حقائق سے آنکھیں بند کر کے
خیالی بنیادوں پر اپنی عمارت اٹھانے کا خیال ذہن میں لاتا ہے۔

اب ہم یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ خود انسانیت کے احترام کا تقاضا ہے
کہ ہم اسے ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں جو اس کے مزاج کی گہرائیوں کو زیادہ بہتر
طور پر سمجھ سکے، اس کی فطرت کی اصل کو پا سکے اور یہ معلوم کر سکے کہ اس کی
جڑیں کتنی گہری جا چکی ہیں۔ اِسی طرح یہ ممکن ہے کہ ہم انسانیت کی رہنمائی اور
اس کی تعمیرِ نو کے اہم کام میں زیادہ دانش مندی، سوجھ بوجھ اور سنبھل سنبھل
کر قدم اُٹھانے کا مظاہرہ کر سکیں۔ لکھو کھہا برس پر پھیلی ہوئی انسانی زندگی جو
دلائل پیش کرتی ہے وہ اتنے ہلکے اور بے وزن تو نہیں قرار دیے جا سکتے
کہ ہم حیاتِ انسانی کی فطرت، اس کی اصل روش اور اس کے میلانات و رجحانات
کی بابت خود سے کچھ نظریات گھڑ لیں اور پھر زبردستی انہیں کو مسلط بھی کر دیں۔

حقِ وراثت و توریث کی بابت ہم تفصیلی گفتگو اجتماعی تکافل کے باب
میں کر چکے ہیں۔ اب یہاں ہم نے جس اسپرٹ پر روشنی ڈالی ہے یہ حق اس کے
عین مطابق اور ساتھ ہی عدل اجتماعی سے اس کی بلند ترین سطح پر، اور مفادِ جماعت
سے اس کے وسیع ترین معنی میں ہم آہنگ ہے۔ یہ تصوّر نوعِ انسانی کی ایک
پشت اور دوسری پشتوں کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار نہیں کھڑی کرتا اور پھر
جیسا کہ آگے آتا ہے یہی حق تقسیمِ دولت کے وسائل میں سے بھی ایک اہم
وسیلہ ہے۔

انفرادی ملکیت کا مزاج

لیکن ایسا نہیں کہ اسلام نے سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ذاتی ملکیت کے حق کو حدود و قیود عاید کیے بغیر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ وہ اس حق کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو کچھ دوسرے اصول و ضوابط بھی دیتا ہے جو اس حق کو اسی درجہ میں جماعت کے مصالح حاصل کرنے کا ذریعہ بنا دیتے ہیں جس درجہ میں کہ اس سے مالک فرد کے مصالح پورے ہوتے ہیں۔ وہ اس حق کو قانونًا تسلیم کرنے کے ساتھ ہی مال کی افزائش، خرچ اور لین دین سے متعلق تصرفات کے لیے متعین ضابطے بھی عطا کرتا ہے۔ ان تمام باتوں کے پیچھے جو چیز کام کر رہی ہے وہ جماعتی مصالح کا لحاظ اور خود فرد کے مفاد کی رعایت ہے۔ ان فطری اغراض و مقاصد کی حدود میں رہتے ہوئے جن پر اسلام زندگی کی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حقِ ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے مال و املاک کے سلسلہ میں فرد کی حیثیت جماعت کے نمائندہ اور نائب کی سی ہے، اس پر اس کا قبضہ ملکیت سے کہیں زیادہ ایک ذمہ داری ہے۔ اپنی عمومی حیثیت میں مال و دولت جماعت کا حق ہے جبکہ خود جماعت بھی اِس معاملہ میں اُس خدا کی نیابت پر مامور ہے جس کے سوا کوئی ذات کسی چیز کی حقیقی مالک نہیں۔ انفرادی ملکیت اس وقت وجود میں آتی ہے جب ایک فرد اپنی ذاتی محنت سے ان اشیاء میں سے کسی چیز کو اپنے قبضہ میں لے آتا ہے جس پر اللہ نے بنی نوعِ انسان کو اپنا نائب بناتے ہوئے ایک عام حقِ ملکیت عطا فرمایا ہے۔

قرآنِ کریم فرماتا ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ۔

(الحدید: ۷)

"اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں تم کو

نائب مقرر کیا گیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔"

آیت کسی تاویل کی محتاج نہیں اور واضح طور پر ہمارے بیان کی تائید کر رہی ہے۔ یعنی انسان کے ہاتھ میں جو مال ہے وہ اصلاً اللہ کا ہے اور انسان کی حیثیت نائب کی ہے نہ کہ اصل مالک کی۔ ایک دوسری آیت میں جو مکاتب غلاموں کی بابت ہے حکم دیا گیا ہے کہ:

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ

(النّور: ۳۳)

"اللہ نے جو مال تم کو دیا ہے اُس میں سے اُن کو دو۔"

گویا یہ مال جو انھیں دیتے ہیں وہ اپنی ملک سے نہیں بلکہ اللہ کے مال میں سے دیتے ہیں اور اُن کی حیثیت صرف ایک درمیانی واسطہ کی ہے۔

دولت کی ذاتی ملکیت کی حقیقت کے بیان میں اِس سے زیادہ واضح اور صریح چیزیں بھی ہیں جو بتاتی ہیں کہ اس کا مطلب تصرّف وانتفاع کے حق سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ واقعی صورتِ حال بھی یہی ہے، کیوں کہ بلا تصرّف اور انتفاع کے حق کے تو ملکیّت ذاتی متحقق ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ اِس حق کے بقاء کی شرط تصرّف کی صلاحیّت کو قرار دیا گیا ہے۔ اور جب کوئی تصرّف میں نادانی اور نالائقی کا مظاہرہ کرے تو سرپرست یا سماج کو حقِّ تصرّف واپس چھین لینے کا حق ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ۔ (النساء: ۵)

"اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے تمھارے گزارے کا ذریعہ بنایا ہے کم عقلوں کے حوالے نہ کر دو۔ (البتہ) اس میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ۔"

تصرّف کا حقِّ رُشد اور اس ذمّہ داری کی بحسن وخوبی انجام دہی پر منحصر

قرار دیا گیا ہے۔ جب مالک اِس ذمّہ داری کو پورا کر کے نہ دے تو ملکیّت کے طبعی نتائج یعنی تصرّف کے جملہ حقوق بھی موقوف ہو جاتے ہیں۔ اِس اصول کی تائید اِس سے بھی ہوتی ہے کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث امام ہوتا ہے۔ کیوں کہ مال دراصل جماعت کا تھا جسے ایک فرد کی نگرانی میں دیا گیا تھا۔ اب جب اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ رہا تو مال جہاں کا تھا وہاں لوٹ آیا۔

اس اصل پر زور دینے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ہم دولت کی "اجتماعی ملکیّت" کا اصول ثابت کریں۔ ذاتی ملکیّت کا حق اسلامی نظام میں ایک بنیادی حق ہے جسے واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ اس پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیّت کے بارے میں صحیح تصوّر قائم کرنے میں اس اصل سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس سے مال و دولت کے بارے میں اسلام کا وہ بنیادی فکر سامنے آتا ہے جس کا تابع ملکیّت کا حق بھی ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکیّت کا اسلامی نظریّہ انفرادی ملکیّت کے سرمایہ دارانہ نظریّہ سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ بالفاظِ دیگر فرد کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ اِس مال میں جو دراصل جماعت کا ہے صرف ایک ذمّہ دار کارپرداز کی حیثیّت رکھتا ہے۔ تاکہ یہ احساس اسے اپنے تصرّفات پر جماعت کی عاید کردہ پابندیوں کو بخوشی تسلیم کر لینے اور اس کی سونپی ہوئی ذمّہ داریوں کو جی سے قبول کر کے آگے بڑھنے پر آمادہ کرے۔ اِسی طرح جماعت کو اِس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ وہی اِس مال کی حقیقی مالک ہے۔ تاکہ وہ فرد پر ذمّہ داریاں ڈالنے یا حد بندی عاید کرنے میں زیادہ جری اور بے باک ہو جائے۔ البتہ ایسا کرنے میں جماعت اسلامی نظام کے ان بنیادی اُصولوں کو مجروح نہ ہونے دے گی جن کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ بالآخر ایسے ضابطے وضع کیے جا سکیں گے جن کے تحت اس مال و دولت سے اس طرح فائدہ اُٹھایا جا سکے جس سے مکمل اجتماعی عدل قائم ہو۔

مال سے انتفاع کے سلسلہ میں اسلام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ مال کا لوگوں کے ایک خاص گروہ میں محدود ہو کر رہ جانا اور انہی کے درمیان اس طرح گردش کرتے رہنا کہ دوسرے لوگ اسے نہ پاسکیں سخت ناپسندیدہ اور سراسر نامطلوب ہے:

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ط

(الحشر: ۷)

"تاکہ مال تمہارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان چکر لگاتا نہ رہ جائے۔"

مطلب یہ ہے کہ مال دار لوگوں سے ان کے مال کا ایک حصّہ لے کر اسے غریبوں کی ملکیّت میں دے دیا جائے۔ اِس نص سے جو تاریخ وابستہ ہے اس کا جاننا اسلام کے اِس بنیادی اصول کو صحیح طور پر سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ مہاجرین مکّہ سے ہجرت کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ چلے آئے تھے۔ غریب مہاجرین کے پاس تو مال تھا ہی نہیں کہ اُسے ساتھ لانے کا سوال پیدا ہوتا۔ خود اغنیاء بھی اپنا مال پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب بالکل محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔ اس موقع پر انصار نے بڑی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ نفس میں جو فطری بخل پوشیدہ ہے وہ اس سے بلند ہو چکے ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا اس میں انھوں نے ان کو بھائی کی طرح شریک کر لیا، یہاں تک کہ اپنی خاص الخاص چیزوں کو بھی مستثنیٰ نہ رکھا۔ اور یہ سب کچھ بالکل خوشی خوشی اور پوری آمادگی کے ساتھ کیا:

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط

(الحشر: ۹)

"جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے آتے ہیں ان کو یہ عزیز رکھتے ہیں، ان کو جو کچھ دیا جائے اس کی یہ خود اپنے لیے خواہش نہیں کرتے، یہ اپنے اوپر انھیں ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ خود تنگ دستی کے شکار ہوں۔"

عقیدہ نفس کو کس طرح سنوارتا ہے، اس کے وہ جیتے جاگتے نمونے بن گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضروریات کے دباؤ سے بے نیازی اور اعلیٰ جذبات اور بلند تصوّرات کی طرف میلان کی ایک مثال بن کر سامنے آئے تھے۔

لیکن اس کے باوجود بھی مدینہ کے امراء اور غریب مہاجرین کے درمیان کا خلا کافی وسیع رہا۔ انصار کی فراخ دلی اور سخاوت کا حال پوری طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا، اِس لیے آپؐ نے ان سے مزید مطالبہ کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی اور نہ انھیں یہ حکم دیا کہ اپنے مال کا کچھ حصّہ مہاجرین کے حوالہ کر دیں کیونکہ وہ خود ہی اپنی ساری املاک میں ان کو بالکل بھائی بنا کر شریک کر رہے تھے۔ یہی حالات تھے کہ بنی نضیر کا واقعہ پیش آیا۔ جنگ نہیں ہوئی بلکہ ایک صلح کے ذریعہ آپ کا قبضہ مان لیا گیا۔ برخلاف عام جنگوں کے جن میں ۴/۵ لڑنے والوں کا حصّہ قرار پاتا اور صرف ۱/۵ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف منتقل کیا جاتا۔ اس بار ساری غنیمت اللہ اور اس کے رسولؐ کی قرار پائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے مسلمانوں کے درمیان تقسیمِ دولت کے باب میں یک گونہ توازن پیدا کرنے کا ایک مناسب موقع جانا چنانچہ آپؐ نے بنی نضیر کی فَے کو مہاجرین کے لیے خاص کر دیا، بجز دو غریب انصاریوں کے جن کو حصّہ دینے کے لیے بعینہٖ وہی وجوہ موجود تھے جو اس فَے کو مہاجرین کے لیے خاص کرنے کے باعث بنے تھے۔ اِسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآنِ کریم فرماتا ہے:

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى
فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ

مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ (الحشر: ۷-۸)

"اِن آبادیوں کے جن اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو (بغیر جنگ) عطا کیا ہے وہ اللہ، اس کے رسولؐ اور رسولؐ کے قرابت داروں، نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت تمھارے صاحبِ ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے۔ جو (حکم یا حق) تمھیں رسول دے اسے تسلیم کر لو اور جن باتوں سے بھی روکے ان سے باز آجاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اللہ بہت سخت سزا دینے والا ہُوا ہے۔ (اور مذکورہ بالا اموال و املاک) ان مہاجرین کے لیے (وقف) ہیں جو اپنے گھر بار اور مال و املاک سے (بیدخل کر کے) نکال دیے گئے ہیں، جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہیں (اور اسی کی خاطر انھیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے) جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے (مشن میں اسکے) مددگار ہیں، درحقیقت یہی لوگ سچے اور راست باز ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس تصرّف اور اُس کی اِس توجیہ سے جو قرآن نے بیان کی ہے، جو اصول سامنے آتا ہے وہ بالکل واضح ہے اور کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں۔ یہ بات واضح طور پر اسلام کا ایک بنیادی اصول متعین کرتی ہے اور وہ ہے اِس بات کا ناپسندیدہ ہونا کہ دولت جماعت کے چند ہاتھوں میں گھِر کر رہ جائے، اور اِس بات کا ضروری ہونا کہ جہاں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے وہاں حالات کی اصلاح کی جائے تاکہ یک گونہ توازن پیدا

ہو سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک طرف دولت کی افراط اور دوسری طرف اس کا فقدان، یہ کیفیت کچھ دلوں میں حسد و کینہ کے جذبات پیدا کرنے کے علاوہ دوسرے گوناگوں مفسدات کو بھی جنم دیتی ہے۔ جہاں بھی زائد از ضرورت دولت پائی جائے اس کی حیثیت وہی ہے جو بدن میں فالتو قوتِ حیات کی ہے کہ اُسے کسی نہ کسی سمت میں لگانا ضروری ہے۔ اب یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ لوگ اُسے ہمیشہ محفوظ سمت میں اور ستھرائی کے ساتھ ہی لگائیں۔ یہ بات توقع کے عین مطابق بلکہ لابدی ہے کہ وہ نفس کو بگاڑ دینے والی اور مہلک عیش کوشی یا اتباعِ شہوات کی شکل اختیار کرلے جسے جماعت کے محتاج طبقوں میں خوب کھل کھیلنے کے لیے ایک وسیع میدان مل جائے۔ یہ طبقہ اصحابِ دولت کی خواہشات کی تسکین اور ان کے کبر و غرور کی پیاس بجھانے کی خاطر آبرو فروشی، عصمت و عفّت کی تجارت، خوشامد اور جھوٹ کے ذریعہ اپنی شخصیّت اور خودی کو فنا کرکے اِس طبقہ سے تعلق جوڑتا ہے کہ مجبوری میں کوئی کیا کچھ نہیں کرتا۔ دولت کی بہتات رکھنے والے کو اِس بات کے سوا اور کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی کہ وہ اپنی فالتو دولت اور فالتو قوتِ حیات کے لیے کوئی مصرف نکالے، بدکاری یا اس قبیل کی ساری چیزیں مثلاً جوا، شراب، بردہ فروشی اور غلاموں کی تجارت اور شرفِ عزّت اور مردانگی کا کھو بیٹھنا یہ سب نتیجہ ہے محض ایک طرف دولت کی بہتات اور دوسری طرف اس کے کال کا۔ سماج میں ہر طرح کا عدمِ توازن بس صرف اسی تفاوت کا نتیجہ ہے۔

دلوں میں جو کینہ پیدا ہوتا ہے اور ان مفلسوں کے دل جنھیں خرچ کرنے کے لیے چند پیسے بھی نہیں میسّر ہوتے بے انتہا دولت رکھنے والوں سے جس طرح پھر جاتے ہیں وہ اِن چیزوں کے علاوہ ہے۔ یہ لوگ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ یا تو حسد میں جلتے رہیں یا ان کی طبیعتیں اِدھر اُدھر لپکیں اور اس

طرح ذلیل و خوار ہوں ۔ ان کی قیمت خود ان ہی کی نظر میں گھٹ جاتی ہے اور طاقت و ثروت کے مظاہر کے سامنے وہ اپنی واقعی عزّت کو بھی حقیر جاننے لگتے ہیں۔ غرضکہ وہ بالآخر انسانوں کے بجائے محض گوشت و پوست کے پُتلے رہ جاتے ہیں جن کو صرف اِس بات کی فکر ہوتی ہے کہ مال و دولت اور جاہ و منزلت کے مالکوں کو خوش رکھیں ۔ سرمایہ دارانہ نظام میں یہی کچھ ہُوا !

اگرچہ اسلام نے معنوی اور تصوّراتی اقدار پر زیادہ توجہ کی ہے لیکن وہ معاشی قدروں کے اثر کو نظر انداز نہیں کرتا ۔ وہ لوگوں کو ان کی ادنیٰ ضروریات سے جتنا بھی بلند دیکھنا ہو لیکن اُن پر انسان کی قوّتِ برداشت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالتا ۔ اِسی لیے اسے یہ گوارا نہ ہُوا کہ دولت صرف اغنیاء کے اندر چکّر کرتی رہے اور اس نے اپنی مالی پالیسی کے سلسلے میں اِس کو ایک مستقل اصول کی حیثیت دے رکھی ہے ۔ اس نے اس مال کے ایک حصّہ کو غریبوں کو دینا لازم قرار دیا تاکہ ان کو روزی کا ایک ایسا ذریعہ حاصل رہے جو ان کے اپنے قبضہ میں ہو اور وہ عزّتِ نفس کے ساتھ آزاد زندگی گزار سکیں تاکہ وہ بُرائیوں کو مٹانے کی وہ ذمّہ داری اَدا کر سکیں جو اِس دین نے ان پر عاید کی ہے، خواہ یہ بُرائیاں حکمرانوں میں پائی جائیں یا محکومین میں ۔

بعض مشترک قسم کے مال ایسے ہوتے ہیں جن کا اپنے قبضہ میں لانا افراد کے لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن میں سے تین کا نام لیا ہے: پانی، گھاس اور آگ ۔

الناس شرکاء فی ثلاثٍ : فی الماءِ وَ الکلاء والنار ۔ (مصابیح السنۃ کے مصنّف نے اِس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے) ۔

"تین چیزوں میں سب کے سب شریک ہیں : پانی، گھاس اور آگ ۔"

ایسا ان چیزوں کی اِس خصوصیت کی بنا پر ہے کہ اس وقت کے عرب میں یہ چیزیں جماعت کی زندگی کے لیے ضروریات میں شمار کی جاتی تھیں۔ اِسی لیے اِن سے انتفاع کا حق پوری جماعت کو یکساں طور پر دیا گیا۔ جماعت کی زندگی کے لیے لازمی اشیاء میں ماحول اور زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور قیاس میں جو اسلامی اصول تشریع میں سے ایک اہم اصول ہے اتنی وسعت موجود ہے کہ ان دوسری چیزوں پر بھی اس کا انطباق کیا جا سکے جو اس حکم کے تحت داخل ہوں۔ شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے بنیادی اصول مجروح نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تمام افراد کو ذاتی ملکیّت سے محروم کر کے حکومت کا تنخواہ دار بنا دیا جائے، کیوں کہ ایسی صورت میں حکومت ان کو غلام بنانے اور دبا کر رکھنے پر اس سے کہیں زیادہ قادر ہو جاتی ہے جتنی قدرت کہ سرمایہ دار افراد کو حاصل ہو سکتی ہے۔ کیونکہ حکومت کے ہاتھ میں اقتدار اور مال دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

مال کا ایک حصّہ ایسا بھی ہے جو جماعت کے بعض ضرورت مندوں کا حق ہے۔ یہی وہ حصّہ ہے جو زکوٰۃ کی صورت میں قانوناً فرض ہے:

فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝

(معارج: ۲۴-۲۵)

"ان کے اموال میں محروم اور (احتیاج کی بنا پر) سوال کرنے والے کا بھی حق ہے۔"

مال، زکوٰۃ دینے والوں کی ملکیّت سے نکل کر زکوٰۃ کے مستحق افراد کی ملکیّت میں داخل ہو جاتا ہے:

انما الصدقٰت للفقراء والمساکین .... الخ

یہ ایک قانونی حق ہے جسے جماعت وصول کرتی ہے اور ایک بار پھر اسے متعیّن افراد تک پہنچا دیتی ہے۔ گویا جماعت کا کام انفرادی ملکیّت کو ایک

طرف سے دوسری طرف اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر دینا ہے۔

پس اسلام میں انفرادی ملکیّت کا مزاج مختصراً یہ ہے کہ:

- دولت کی اصل مالک جماعت ہے، اپنی عمومی حیثیّت میں۔
- ذاتی ملکیّت ایک مشروط اور پابند ذمّہ داری ہے۔
- دولت کی بعض شکلیں عام اور مشترک ملکیّت شمار ہوتی ہیں، کسی فردِ واحد کو ان پر قبضہ کا حق نہیں۔ ان سے سب لوگ شرکت کے اصول پر فائدہ اُٹھائیں گے۔
- دولت کا ایک حصّہ جماعت کا حق ہے جو اس کی طرف لوٹ جائے گا تاکہ وہ اس کو متعیّن گروہوں تک پہنچا دے جو اس کے محتاج ہیں، تاکہ اس کا اور اس کے ساتھ ہی جماعت کا حال دُرست اور بہتر ہو سکے۔

ذاتی ملکیّت کے ذرائع

قبضہ اور ملکیّت کی حقیقت کے باب میں اِس نظریہ پر اسلام اس کے منطقی نتائج بھی مرتّب کرتا ہے، وہ قبضہ کے شرائط متعیّن کرتا ہے، تصرّف پر پابندیاں عاید کرتا ہے اور انتفاع کے لیے حدّیں مقرر کرتا ہے۔ اِس طور پر ملکیّت ہمیشہ اسی دائرہ میں رہتی ہے جو جماعتی مصلحت اور اس سے کبھی نہ الگ ہونے والی، اسی میں شامل، فرد کی مصلحت اس کے لیے متعیّن کرتی ہے۔

سب سے پہلے وہ بتاتا ہے کہ ملکیّت یعنی شئے مملوک سے انتفاع کا حق، شارع کے اِذن کے بغیر نہیں متحقّق ہوتا، کیوں کہ شارع ہی جماعت کے جملہ معاملات کا نگران ہے۔ "کیوں کہ در حقیقت یہ شارع ہی ہے جس نے اسے سبب شرعی پر منحصر قرار دے کر انسان کو ملکیّت کا حق عطا کیا چنانچہ ملکیّت کی مختلف تعریفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ملکیّت" کسی شے کی ذات یا اس کے فائدہ سے متعلق ایک شرعی حکم ہے جو اِس بات کا متقاضی

ہے کہ جس فرد کی طرف اس حکم کی اضافت کی جائے اُسے اُس شے سے انتفاع کا اور اُسے دے کر اُس کی قیمت وصول کرنے کا حق دار سمجھا جائے۔"

"فقہائے اسلام کی متفقہ رائے ہے کہ ملکیت اُسی وقت متحقق ہوتی ہے جب خود شارع اُسے عطا کرے یا تسلیم کرے۔ اِس لیے کہ سارے حقوق جن میں حقِ ملکیت شامل ہے بلا شارع کے عطا کیے یا اس کے اسباب کو تسلیم کیے نہیں ثابت ہوتے۔ یہ حق اشیاء کی طبیعت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ شارع کے اِذن سے اور اِس بات سے وجود میں آتا ہے کہ اس نے شرعی طور پر سبب کو مسبّب کے وجود میں لانے کا ذریعہ تسلیم کیا ہے۔"[1]

حقِ ملکیت کے بارے میں اسلامی نظریّہ کی وضاحت میں یہ بات کافی اہمیّت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اِس کی رُو سے ملکیت جماعت کے نائب کی حیثیت میں شارع کی طرف سے دیا ہوا کسی خاص چیز پر قبضہ کا وہ حق ہے جو وہ کسی فرد کو دیتا ہے، اگر یہ تملیک نہ ہوتی تو اس فرد کا قبضہ کبھی دُرست نہ ہوتا — کیوں کہ اصل یہ ہے کہ مال اللہ کا ہے اور بنی نوع انسان اس میں خلیفہ کے طور پر متصرف ہیں۔ شارع ہی اِس کا مجاز ہے کہ کسی چیز کے اپنی ذات کے لیے مخصوص کرنے کی اجازت دے، خواہ یہ اجازت کسی اُصولِ عام کے تحت ہو یا کسی خاص اجازت نامہ کے ذریعہ۔

اسلام میں ملکیت کا حق پانے کا واحد ذریعہ عمل ہے "عمل" اپنی تمام قسموں اور تمام شکلوں میں۔ اِس طور پر محنت اور اس کی جزا کے درمیان مساوات قائم رکھی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دولت کے حاصل کرنے اور اس کا مالک قرار پانے کی جن شکلوں کو اسلام دُرست تسلیم کرتا ہے وہ یہ ہیں:

---

[1] "الملکیۃ ونظریۃ العقد فی الشریعۃ الاسلامیۃ"۔ مصنّفہ استاذ ابوزہرہ، پروفیسر اسلامی قانون، لاء کالج، قاہرہ یونیورسٹی۔

۱- شکار

یہ انسانی زندگی کا قدیم ترین ذریعہ معاش رہا ہے۔ اب بھی متمدّن اور ترقّی یافتہ ممالک میں یہ مختلف اقسام کے مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنا ہُوا ہے۔ مچھلی، موتی، مرجان، اسفنج اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کا شکار آج بھی قوموں اور افراد کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصّہ فراہم کرتا ہے۔ یہی حال تجارت کے لیے یا تفریحی طور پر چڑیوں اور جانوروں کے شکار کا بھی ہے۔

۲- جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو ان کو کسی طریقہ سے کار آمد بنا لینا

اِس سلسلہ میں یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ زمین پر قبضہ کرنے کے بعد تین سال کے اندر اندر وہ شخص اس کو کار آمد بنا لے ورنہ اس کا حقِ ملکیت زائل ہو جائے گا۔ کیوں کہ اصل غرض یہ ہے کہ افتادہ زمینیں کار آمد بنائی جائیں تاکہ اس سے فائدہ اُٹھانے سے جو مصالح وابستہ ہیں وہ متحقق ہو سکیں۔ تین سال کی مدّت اس بات کو جانچنے کے لیے کافی ہے کہ قبضہ کرنے والا کار آمد بنانے پر قادر ہے یا نہیں۔ اتنے عرصہ میں اگر اس قدرت کا ثبوت دینے والے کوئی بھی مظاہر سامنے نہیں آئے تو افتادہ زمین دوبارہ جماعت کی طرف لوٹ آئے گی اور کوئی فرد اس کا مالک نہ سمجھا جائے گا۔

عادیّ الارض للہ و لرسولہٗ ثم لکم من بعد فمن احیا ارضاً میتاً فھی لہٗ ولیس لمحتجز حق بعد ثلاث سنین۔ (قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اِس حدیث کو لیث عن طاؤس کے واسطہ سے روایت کیا ہے)۔

"افتادہ زمینیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی مِلک ہیں۔ اس کے بعد وہ تمھاری ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی کسی افتادہ زمین کو کار آمد بنائے وہ اس کی ہو جائے گی۔ البتہ کسی ہاتھ ڈالنے والے کا تین سال

بعد کوئی حق نہ تسلیم کیا جائے گا۔"

اِس معاملہ میں اسلامی قانون آج کے اِس خود ساختہ قانون سے بہتر ہے جو فرانسیسی قانون کو سامنے رکھ کر وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون میں صرف پندرہ سال تک قبضہ کو اس بات کے لیے کافی تسلیم کیا گیا ہے کہ زمین قابض کی ملکیت قرار پا جائے خواہ وہ اُسے کار آمد بنائے یا اس عرصہ میں اور اس کے بعد بھی اسے یونہی ناکارہ چھوڑے رہے۔ یہاں حقِ ملکیت دینے میں جو حکمت کام کر رہی ہے وہ محض ایک منفی حکمت ہے اور صرف "صورتِ واقعہ" کو قانوناً تسلیم کرنے کا نظریہ فیصلہ کُن بن رہا ہے۔ یہاں اسلامی نظریہ اور خود ساختہ قانون کے نظریہ کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔

۳- زمین کے اندر جو کانیں (رکاز) ہیں ان کو نکالنا

کان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کا ۴/۵ حصہ نکالنے والے کی مِلک قرار پاجاتا ہے اور ۱/۵ زکوٰۃ۔ کیوں کہ یہ دفینہ اصلاً مباح تھا جسے فرد محنت مشقت کر کے حاصل کرتا ہے۔

یہاں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ درحقیقت جس وقت یہ حکم صادر کیا گیا تھا اس وقت تک "رکاز" سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا وہ صرف قلیل الاستعمال معدنیات تھے۔ مثلاً سونا اور چاندی۔ اور یہ چیزیں پٹرول اور کوئلہ کی طرح کی نہیں جن کی ضرورت مند ساری جماعت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پٹرول کوئلہ، لوہا اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو پانی، گھاس اور آگ جیسی مشترک قرار دی گئی ضروری چیزوں پر قیاس کیا جائے گا یا ان رکاز پر جو اسلام کے ابتدائی دَور میں معروف تھے۔

اس مسئلہ میں ہم مالکیہ کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں جن کے مطابق یہ اقسامِ دولت ملکیتِ عامّہ قرار پاتی ہیں اور ان کی ملکیت اس زمین کے مالک کی طرف نہیں منتقل ہوتی جس سے کان برآمد ہو۔ کیوں کہ زمین کا مالک ہونا اس کے

اندر پائی جانے والی چیزوں کی ملکیت کو مستلزم نہیں جب کہ زمین کی ملکیت یا
اس کی طلب عام طور پر ان کانوں کے لیے نہیں ہوتی۔

۴۔ خام مواد سے مصنوعات کی تیاری

تاکہ اس سے زندگی کی کوئی ضرورت پوری ہو اور ایسا فائدہ حاصل ہو سکے
جو اس کے خام مواد ہونے کی صورت میں نہیں حاصل کیا جا سکتا تھا یا اس میں
ایسی خصوصیات کا اضافہ جس سے وہ پہلے سے زیادہ مفید ہو جائے۔ اس عمل میں
مختلف انواع کی محنت کی اہمیت ظاہر ہے۔

۵۔ تجارت

اس کے مختلف مراحل ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سارے مراحل ایک ہی
آدمی طے کر لے اور یہ بھی کہ متعدد افراد مل کر ان مراحل کو طے کریں۔ بالآخر جو
مقصد حاصل ہوتا ہے وہ خام مال یا مصنوعات کا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ
میں منتقل ہونا ہے، جس کے نتیجہ میں اس خام مال یا تیار شدہ سامان سے زیادہ فائدہ
اٹھانا ممکن ہو جاتا ہے۔

۶۔ اُجرت کے عوض کسی دوسرے کی خاطر محنت کرنا

اسلام اِس طرح کی محنت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس
کی اُجرت کو بلا کسی تاخیر اور بلا کسی تخفیف کے پوری پوری ادا کرنے کا حکم دیتا
ہے۔ خود قرآن عمل پر اُکساتا ہے اور اُسے نگاہوں کا مرکز اور غور و فکر کا مقام
قرار دیتا ہے:

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ (التوبہ: ۱۰۵)

"کہہ دیجیے کہ عمل کر کے دکھاؤ، اللہ، اس کا رسولؐ اور مومنین
تمھارے عمل کا جائزہ لیں گے۔"

اِس آیت میں کام کو حسن و سلیقہ اور خوش اسلوبی سے انجام دینے پر ابھارا

گیا ہے۔ پھر اس میں محنت کی تعظیم پائی جاتی ہے اور اسے مطالعہ کرنے، غور و فکر اور اس کے نتائج کے انتظار میں رہنے کے قابل قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر عمل اور اس کی خاطر زمین میں چلنے پھرنے پر اُبھارا گیا ہے:

فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ ط (الملک: ۱۵)

"اس کے اوپر چلو اور اس کی روزی میں سے کھاؤ"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محنت کا رتبہ بلند ہونے کے بارے میں متعدد احادیث منقول ہیں:

إِنَّ اللهَ يحب العبد المؤمن المحترف (اس حدیث کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)۔

"اللہ اس بندۂ مومن کو عزیز رکھتا ہے جو کسی پیشے کے ذریعہ اپنی روزی کماتا ہو"۔

ما اكل احد كم طعامًا قط خيرا من عمل يده۔

(بخاری)

"اپنے ہاتھوں کی کمائی کھانے سے بہتر تم نے کبھی کوئی کھانا نہ کھایا ہوگا"۔

محنت کی قدر و منزلت اور اس کی بزرگی و احترام کے اس نظریّہ کی بنیاد پر اسلام مزدور کے حقِ اُجرت کو ایک مقدّس حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور جو کوئی محنت کشوں کا یہ حق دبا بیٹھنے کی کوشش کرے اُسے وہ یہ جتلا کر ڈراتا ہے کہ ایسا کرنے والا در اصل اللہ سے لڑائی مول لیتا ہے اور اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، قال الله عزّوجل: ثلاثة انا خصمهم يوم القيامة، رجل

اعطی بی ثم غدر، ورجل باع حرًّا فاکل ثمنه و

رجل استاجر اجیرًا فاستوفی منه ولم یعطه اجره۔

(بخاری)

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تین طرح کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اُن سے نپٹنے والا خود مَیں ہوں گا۔ ایک تو وہ شخص جس نے میری قسم کھا کر کسی کو زبان دی اور پھر اپنے وعدے سے مکر گیا۔ دوسرا وہ جس نے کسی آزاد شخص کو بیچ کر اس کی قیمت وصول کی، اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو اُجرت پر بُلایا اور اُس سے پورا کام لینے کے بعد بھی اُسے اُس کی مزدوری نہ دی۔"

اِن تینوں گناہوں کو ایک ساتھ رکھنے اور ان کی سزا یکساں رکھنے میں ایک خاص معنی پنہاں ہیں۔ پہلا گناہ صریح خیانت اور اللہ کی دی ہوئی ضمانت کی بے حُرمتی ہے۔ دوسرا انسانیت کی توہین کے ہم معنی ہے، ایک آزاد شخص اور اسے فروخت کر کے اس کی قیمت کھانا! تیسرا گناہ مزدور کے پسینہ کے پھل کا خود ہڑپ کر جانا ہے۔ یہ آزاد شخص کی قیمت کھانے کی طرح انسانیت کے ساتھ ایک غدّاری ہے۔ اور اللہ کی قسم کھانے کے بعد بدعہدی کی طرح اللہ کی دی ہوئی ضمانت کی بے حُرمتی بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خباثت اور اپنے اندر نمایاں طور پر موجود غدّاری کی بنا پر اللہ کی طرف سے جواب طلبی اور اعلانِ جنگ کا مستحق ہے۔ پُرزور ہدایت ہے کہ یہ اجر وقت کے وقت ادا کیا جائے۔ صرف پوری پوری ادائیگی کافی نہیں بلکہ بلا تاخیر ادائگی ضروری ہے۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

اعطوا لاجیر حقه قبل ان یجف عرقه۔

(مصابیح السنّۃ، فی الصحاح)

"مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے
ادا کر دو۔"

اس ہدایت میں اسلام نے مزدور کی صرف مادّی ضروریات ہی کو ملحوظ نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی نفسیاتی ضرورت کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ نفسیاتی طور پر اس کی تسکین کا سامان یوں کیا گیا ہے کہ اسے یہ احساس دلایا جائے کہ اس کے مسئلہ کو اہمیت دی جا رہی ہے اور اسے پوری توجہ اور اعتناء کے قابل سمجھا جا رہا ہے۔ اجرت کی ادائیگی میں جلدی اسی خوبی کی حامل ہے۔ اس طرح اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی محنت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور یہ کہ سماج میں اس کا ایک مقام تسلیم کیا گیا۔ جہاں تک لازمی ضروریات کا سوال ہے مزدور عموماً اپنی مزدوری کا فوری طور پر محتاج ہوتا ہے تاکہ اس سے وہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات کی تکمیل کر سکے۔ اسی وجہ سے اُجرت میں تاخیر اس کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے محنت کے پھل کی جس وقت سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے، یہ تاخیر اسی وقت اس سے محروم کر دیتی ہے۔ اِس طرح نہ کام میں لگن باقی رہتی ہے نہ اس سلسلہ میں نشاط باقی رہتا ہے۔ اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ جو کوئی بھی کچھ کام کر سکتا ہو کرے جتنا زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہو کرے اور نفسیاتی طور پر اطمینان و رضامندی اور مادّی طور پر معقول معاوضہ سے لطف اندوز ہوتا رہے۔

مزدور کے حق کا اتنا خیال رکھنے کے بدلے اسلام اس سے یہ چاہتا ہے کہ وہ کام کو خوب اچھی طرح اور حسن و خوبی سے انجام دے۔ کیونکہ اسلام میں حق ہر کسی نہ کسی فرض کے بدلہ میں ملتا ہے یہ محنت اور اس کے ثمرہ میں برابری کے اصول کا بھی ایک فطری تقاضا ہے اور اخلاقی پہلو سے بھی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اسلام اخلاق کو زندگی کی بنیاد بنانا چاہتا ہے۔ دھوکہ دہی اور کام میں سہل انگاری، احساسِ ذمّہ داری کے فقدان اور ضمیر کے مردہ ہو جانے

کا ثبوت ہے۔ ان دونوں خصلتوں میں برابر مبتلا رہنا اور ان پر اصرار احساسِ ذمہ داری کو بالکل ختم کر دینے اور ضمیر کو کھوکھلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ جماعت کے جملہ صالح اس طرح جس عظیم فساد اور افراتفری کا شکار ہوتے ہیں وہ الگ ہیں۔

یہاں ہم یہ بحث نہیں اُٹھائیں گے کہ مزدور کی اُجرت کتنی ہونی چاہیے اور اس کی تعیین کس اصول پر مبنی ہو گی۔ آیا اس عرصۂ وقت کا لحاظ بنیادی اہمیت رکھتا ہے جو اشیاء کی پیداوار میں صرف ہو، یا مارکس کی اصطلاح میں "ضروری اجتماعی محنت" کا۔ یہ تفصیلات سے متعلق مباحث ہیں جن کا صحیح محل اسلامی معاشیات پر کی جانے والی علیحدہ تصانیف ہیں۔

۷۔ جنگ

جنگ سے سَلَب کی ملکیت پیدا ہوتی ہے جس کے تحت وہ ساری چیزیں آجاتی ہیں جو کسی مشرک مقتول کے پاس اس وقت ہوں جب کوئی مسلمان اسے قتل کرے:

من قَتَلَ قَتِيلًا لهُ عليه بيّنةٌ فسَلَبه لهُ۔

(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)۔

"جو کسی مشرک کو قتل کرے تو اس کی سلب اس کی ملکیت قرار پائے گی بشرطیکہ وہ اس امر کی باقاعدہ گواہی پیش کرے۔"

دوسری چیز جس کی ملکیت جنگ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے وہ مالِ غنیمت ہے جس کا ۴/۵ حصہ جنگ کرنے والوں کا حق ہے اور ۱/۵ حصہ اللہ اور اس کے رسول کا۔

وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ۔ (الانفال: ۴۱)

"جان لو کہ جو چیزیں تم کو غنیمت کے طور پر حاصل ہوں ان کا ۵/۱ اللہ کا، اس کے رسولؐ، رسولؐ کے قرابت داروں، یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔"

۸۔ سلطان کا ان زمینوں میں سے کسی کو کچھ عطیہ کے طور پر دے دینا جن کا کوئی مالک نہ ہو

اور جو لاوارث زمینیں مشرکین کی طرف سے جن کا سرپرست امام قرار پاتا ہے، بیت المال میں آئی ہوں، یا اسی طرح ان ناکارہ زمینوں میں سے جن کا کوئی مالک نہ ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو زمینیں عطا فرمائی تھیں۔ آپؐ کے بعد خلفاءؓ بھی عطیہ کے طور پر زمینیں دیتے رہے ہیں۔ یہ عطایا اسلام کی کسی خدمت یا کسی نمایاں کارنامہ کے صلہ میں دیے جاتے تھے، لیکن بہت محدود پیمانہ پر۔ اور صرف انھی زمینوں میں سے جو یا تو ناکارہ ہوں یا ان کا کوئی مالک نہ ہو۔ جب بنی امیہ کا زمانہ آیا تو انھوں نے لوگوں کو لوٹنا اور زمین کے عطایا اپنے اعزہ و اقرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس لیے کہ جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا یہ لوگ خلفائے راشدین میں سے نہ تھے بلکہ ان کا شمار ظالم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

۹۔ بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا

چنانچہ اسلام نے زکوٰۃ کے مال کا متعین مدات میں صرف کیا جانا ضروری قرار دیا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ط (التوبہ: ۶۰)

"صدقات کے مستحق صرف فقراء، مساکین اور صدقات (کی تحصیل و تقسیم) پر مقرر کردہ کارندے ہیں، اور وہ لوگ جن کی تالیفِ قلب

مقصود ہو، اور گردنیں چھڑانے میں، مقروض کی مدد میں، اللہ کی راہ میں
مسافروں پر (بھی صدقات میں سے صرف کیا جائے گا)۔"

اِن میں سے کسی ایک میں شامل ہونا، کسی شخص کو مال زکوٰۃ میں سے ایک حصّہ کی ملکیّت کا حق دار بنا دیتا ہے۔ اِن لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے سلسلہ میں بجز ضرورت مندی کے اور کوئی وجہ نہیں کام کر رہی ہے۔ گویا ضرورت کو اضطرار کی شکل میں محنت کا بدل قرار دے دیا جاتا ہے جسے اسلام نے ایک بلند درجہ عطا کیا ہے اور ملکیّت حاصل کرنے کا پہلا اور آخری ذریعہ قرار دیا ہے۔

۱۰۔ محنت کی مختلف نئی صورتیں جو جسمانی یا ذہنی سعی و جہد کی شکل میں سامنے آتی ہیں

یہی وہ اسباب ہیں جن کو اسلام ابتداءِ ملکیّت کے سلسلہ میں جائز تسلیم کرتا ہے۔ اِن کے علاوہ جو بھی طریقے ہیں اسلام ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ چوری، ڈاکہ اور لوٹ مار یا مجرّد قبضہ ملکیّت کا باعث نہیں بن سکتے۔ یہی حال جوئے کا بھی ہے کہ اسے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ
مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

(مائدہ : ۹۰)

"شراب، جوا، پانسے اور (غیر خدا کے) استھان شیطانی حرکتیں
اور ناپاک اُمور ہیں، ان سے بچو تاکہ تم فلاح یافتہ ہو سکو۔"

جو مال حرام طریقے سے کمایا جائے وہ حرام ہی سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت جوئے بازی کوئی "کام" نہیں بلکہ محض زبردستی اور فریب ہے۔ اس پر مستزاد وہ بغض و عناد ہے جو یہ جوا کھیلنے والوں کے درمیان پیدا کرتا ہے اور جو اسلام کے اہم ترین اصول یعنی بھائی چارہ اور تعاون کی اس اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ أَنْ يُّوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ۔ (مائدہ : ۹۱)

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے۔"

ان تمام اسباب کی حکمت واضح طور پر ان کا "محنت" پر مبنی ہوتا ہے، محنت بہرحال جزا کی مستحق ہے کہ اسی پر زندگی کی فلاح و بقا منحصر ہے۔ زمین کو آباد اور کارآمد بنانا، سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا، نفس کی صفائی، ضمیر کی تطہیر، سب اسی پر منحصر ہیں۔ تزکیہ روحانی، جسم کو تقویت پہنچانے اور سستی، کاہلی اور گمنامی کے عوامل سے انسان کو بچائے رکھنے وغیرہ اُمور جس حسن و خوبی کے ساتھ محنت کے ذریعہ انجام پاتے ہیں کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔

جب تک حصولِ ملکیت کا واحد ذریعہ "عمل" کی مختلف صورتیں ہوں، انفرادی ملکیت کا ان حدود کے اندر تسلیم کیا جانا جن کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے کسی کے لیے ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فرد کو اس بات پر اُبھارتا ہے کہ اپنی انتہائی کوششیں بھی کر گزرے۔ اِسی طرح اسے اس بات کا موقع ملتا ہے کہ مقررہ حدود میں رہتے ہوئے اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچاتے ہوئے اپنے قبضہ میں لانے اور 'ملکیت میں رکھنے' کے رجحانات کو پورا کر سکے۔ اگر وہ اِن حدود سے تجاوز کرتا ہے تو منصفانہ طریقہ یہ ہے کہ اسے حدود کے اندر لوٹ آنے پر مجبور کیا جائے نہ یہ کہ اس کو ہر طرح کی سرگرمیوں سے روک کر پست ہمت، گمنام اور کم تر استعداد رکھنے والوں کے برابر کر دیا جائے۔ یہ طریقہ مناسب نہ ہوگا کہ غلط استعمال کو روکنے کے بہانے فرد کو سرے سے حقِ ملکیت ہی سے محروم کر دیا جائے۔ کیوں کہ غلط استعمال کا علاج ممکن ہے اور ضرورت کے مطابق مداخلت کر کے اسے روکا جا سکتا ہے۔

ملکیت کے اسی نظریہ کا نتیجہ ہے کہ اسلام انتقالِ ملکیت کے طریقوں میں

بھی مداخلت کرتا ہے اور فرد کو اس سلسلہ میں بالکل آزاد نہیں چھوڑتا۔ خرید و فروخت اور دوسرے معاہدوں، وراثت اور وصیت کے ضابطوں سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہے۔ صرف ہبہ اور ہدیہ کو ہر قید سے آزاد رکھا گیا ہے، اور صاحبِ مال کو اس بات کا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا مال جس کو چاہے ہبہ کر دے یا ہدیۃً دے دے۔ اِس گنجائش کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں طبیعت خود ہی ایک روک ثابت ہوتی ہے اور صاحبِ مال اپنے مال کا ایک حصّہ ہی ہدیہ یا ہبہ کے طور پر دیتا ہے۔ اِس سے وارث کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ یہی حال وصیت کا بھی ہے۔ اب اگر وہ اسراف پر اُتر آتا ہے تو اُسے بے جا تصرف کرنے والا قرار دیا جائے گا اور اس پر قانونی پابندی عاید کی جا سکے گی۔ یعنی اُسے اپنی ملکیت میں تصرّف کے حق سے محروم کیا جا سکے گا۔

مالک کے قبضہ کا اُٹھنا اور مال کا اس کے بعد ورثاء یا جن لوگوں کے حق میں وصیت کی گئی ہو ان کی طرف منتقل ہونا ایک مقرر ضابطہ کے تحت عمل میں آتا ہے جس کی حکمتیں علیحدہ ہیں۔ چنانچہ "کسی وارث کے لیے وصیت نہیں کی جا سکتی"۔ اور نہ ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت کا کوئی دخل ہو گا کہ یہی آخری حد ہے۔ جیساکہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وصیت کی اجازت بعض خاص طرح کے حالات کے پیشِ نظر دی گئی ہے۔ بسا اوقات بعض ایسے قریبی رشتہ دار وراثت سے محروم رہ جاتے ہیں جن کے رشتہ اور تعلّق کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو بھی کچھ ملے لیکن رشتہ داری میں ان کا مقام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے ورثاء ان تک وراثت پہنچنے میں مانع ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے اس پہلو کے اعتبار سے وصیت حسنِ سلوک اور صدقہ کی ایک قسم ہے۔

وراثت کے ذریعہ مال اِس ضابطے کے مطابق منتقل ہوتا ہے جس کا بیان میراث کی آیتوں میں آیا ہے (یہ آیات اجتماعی تکافل کی بحث میں گزر چکی ہیں)۔ حصّوں کے بارے میں جس عام قاعدہ کی پابندی کی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے

لیے دو عورتوں جتنا حصّہ ہے۔ اس اصول کی حکمت ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ پدری رشتے کی رُو سے وارث ہونے والا ماں کے رشتہ سے وراثت کا مستحق قرار پانے والے پر ترجیح پاتا ہے۔ گو بعض حالات میں مؤخر الذکر کو زیادہ حصّہ بھی مل جاتا ہے۔ (دونوں میں اِس تفریق کی) وجہ حقوق کو ذمّہ داریوں کی مناسبت سے تقسیم کرنے کا اصول ہے۔ کیونکہ پدری رشتہ سے وارث ہونے والے پر مُورث کے سلسلہ میں زیادہ ذمّہ داریاں عاید تھیں۔ اس طرح خاندان میں بیٹے کو دادا اور دادی کا حصّہ علیٰحدہ کرنے کے بعد سب کا سب مل جائیگا۔ کیوں کہ اگر ضرورت تقاضا کرتی تو باپ کی زندگی میں اس کی کفالت ان کے ہی ذمّہ ہوتی۔ حقیقی بھائی سوتیلے بھائی کو وراثت سے محروم کر دے گا۔ کیوں کہ اگر اس کا حقیقی بھائی کسبِ معاش سے عاجز رہ جاتا تو اس کی کفالت کا شرعاً یہی ذمّہ دار ہوتا۔ اِس طرح اِس ضابطہ میں ایک منصفانہ تقسیم کے ذریعہ فوائد اور ذمّہ داریوں، حقوق اور فرائض کے درمیان ایک مناسب توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

قانون وراثت کی حکمتوں اور اس کے دُور رس اثرات پر ہم اجتماعی تکافل کی بحث میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ وہیں ہم نے اِس تکافل یا رشتہ داروں اور پھر مختلف پشتوں کے درمیان ربط و تعلق کو مضبوط کرنے والے دوسرے اصولوں سے اس قانون کی ہم آہنگی بھی واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ کِس طرح یہ ضابطے فرد اور جماعت دونوں کے مفادات وضروریات نیز فطرت اور طبعی میلانات کی یکساں رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔

اب یہاں ہم نظامِ وراثت کی ان حکمتوں پر غور کریں گے جو خصوصیت کے ساتھ اجتماعی پہلو سے متعلق ہیں۔

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام دولت کے ارتکاز اور اس کے ایک طبقہ کے اندر محدود ہو کر رہ جانے کو پسند نہیں کرتا اور اسلام کا نظامِ وراثت

پشت در پشت جمع ہونے والی دولت کی تقسیم کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعہ ایک ملکیت محض مالک کی وفات سے اس کی متعدد اولاد اور اعزہ کو منتقل ہو جاتی اور اس طرح چھوٹے چھوٹے یا متوسط حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اِس ضابطے کے باوجود ملکیت جیوں کی توں رہ جائے۔ اِن شاذونادر پیش آنے والے حالات کے لیے کوئی اصول بنانا ممکن نہیں (مثلاً یہ کہ مالک صرف ایک بیٹا چھوڑ کر وفات پائے جو اس کے سارے ترکہ کا وارث قرار پا جائے گا کیونکہ متوفیٰ کے باپ، ماں یا بیوی اور لڑکی میں سے کوئی زندہ نہیں رہا) زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ دولت متعدد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس ضابطہ کا دوسرے ضابطوں مثلاً انگریزوں کے ضابطہ سے مقابلہ کرتے ہیں جو ترکہ کا تمام تر مستحق بڑے لڑکے کو گردانتا ہے تو ہم پر اسلام کی یہ حکمت کہ وہ جمع شدہ دولت کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اسلامی ضابطہ میں ورثاء کے مابین جو عدل ملحوظ رکھا گیا ہے وہ اِس پر مستزاد ہے۔ اس کا عدل صرف بڑے لڑکے کے لیے مخصوص نہیں۔

ملکیّت کو نمو بخشنے کے طریقے

ملکیتِ دولت کی بابت اسلام جس نظریّہ کا قائل ہے اس کے تحت اس نے مال کے ذریعہ مزید مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے طریقوں میں بھی مداخلت کی ہے۔ وہ مالک کو اس بات کی کھُلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ اِس سلسلہ میں من مانی کرتے رہیں۔ کیوں کہ فرد کی ذاتی مصلحت کے پہلو بہ پہلو اس جماعت کی مصلحت بھی قابلِ لحاظ ہے جس سے فرد معاملات کرتا ہے۔

چنانچہ ہر فرد کو مال کے ذریعہ نفع کمانے کی پوری آزادی ہے لیکن قانونِ الٰہی کے مقرر کردہ حدود کے اندر۔ اسے پوری آزادی ہے کہ زمین میں کاشت

کرے ۔خام مال کے ذریعہ مصنوعات تیار کرے ۔ تجارت کرے وغیرہ وغیرہ۔
لیکن اس کی اجازت کہ وہ دھوکہ دہی پر اُتر آئے، یا عام ضرورت کی اشیاء کو قیمت چڑھنے کے انتظار میں ذخیرہ کیے رہے، یا اپنی دولت کو سود پر دے، یا مزدوروں کی اُجرت کے سلسلہ میں ظلم و زیادتی سے کام لے کر خود اپنے نفع میں اضافہ کرے ۔ یہ سب کچھ اِس پر حرام کر دیا گیا ہے ۔ اسلام افزائشِ دولت کے لیے صرف پاکیزہ اور ستھرے ذرائع ہی کو رَوا رکھتا ہے، اور پاکیزہ ذرائع کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سرمایہ کو اس حد تک بڑھنے کا موقع نہیں دیتے کہ طبقاتی فرق میں اضافہ ہوتا چلا جائے ۔ آج ہم سرمایہ میں جو بے تحاشا اضافہ دیکھتے ہیں اس کی وجہ دراصل دھوکہ فریب، سود، مزدور کی حق تلفی، احتکار، عوام کی ضروریات سے بے جا فائدہ اٹھانا، اُچکا پن، چوری، غصب وغیرہ وہ جرائم ہیں جو آج کے معروف طریق ہائے استحصال (Exploitation) میں مضمر ہیں ۔ اسلام ان کی اجازت کبھی نہیں دیتا ۔ آیئے اب ہم افزائشِ دولت کے سلسلہ میں احکام اوران کی حکمتوں کا مطالعہ کریں ۔

۱ ۔ اسلام کاروبار میں بددیانتی کو حرام قرار دیتا ہے

من غشّ فلیس منّی (اصحاب السنن)

"جس نے (کاروبار) میں دھوکہ دیا وہ میرا پیرو نہیں"۔

البیعان بالخیار مالم یتفرّقا فان صدقا و بیّنا بورك لهما فی بیعهما وان کتما و کذبا محقت برکة بیعهما ۔ (بخاری و مسلم)

"خریدار اور فروخت کنندہ جب تک ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو جائیں وہ معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پورا اختیار رکھتے ہیں ۔ اگر انھوں نے راست بازی اور درست بیانی سے کام لیا تو ان کے معاملہ میں برکت ہوگی اور اگر غلط بیانی اور دعیوب کے) اخفاء

کا طریقہ اختیار کیا تو ان کے معاملۂ بیع کی برکت ختم کر دی جائے گی۔"

گویا آپ کو خرید و فروخت کی پوری آزادی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ نہ تو مال میں کسی طرح کا دھوکہ ہو نہ دام میں۔ اگر کسی چیز میں کوئی عیب ہو تو اس کا بتا دینا لازم ہے ورنہ آپ دھوکہ باز قرار پائیں گے اور جو نفع کمایا ہو گا وہ بھی آپ کے لیے حرام ہو گا۔ اِس حرام نفع کو صدقہ کر دینا بھی آپ کو مواخذہ سے نہیں بچائے گا۔ کیوں کہ وہی صدقہ آپ کے حساب میں لکھا جائے گا جو حلال کمائی میں سے کیا جائے گا۔

عن عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہٗ قال: "لا یکسب عبدٌ مالا حرامًا فیتصدق منہ فیقبل منہ ولا ینفق منہ فیبارک لہٗ فیہ۔ ولا یترکہ خلف ظھرہ۔ الّا کان زادہ الی النار۔ ان اللہ لا یمحو السیئ بالسیئ ولکن یمحو السیئ بالحسن، ان الخبیث لا یمحو الخبیث۔ (ذکرہ صاحب مصابیح السنۃ فی الصحاح)۔

"عبد اللہؓ بن مسعود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص حرام مال کمائے اور اس میں سے صدقہ خیرات کرے تو وہ (عند اللہ) قبول کر لیا جائے یا وہ اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو سکے۔ وہ ایسے مال کو اگر اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو یہ اس کے لیے راہِ جہنم کا توشہ ثابت ہوتا ہے۔ اللہ برائی کی تلافی برائی کے ذریعہ نہیں کرتا بلکہ برائی کو اچھائی ہی کے ذریعہ مٹایا جا سکتا ہے ناپاک چیز ناپاک چیز کا دفعیہ نہیں کر سکتی۔"

آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

انا کلا یربو لحم نبت من سحت الا کانت النار

اولی بہ" (ترمذی۔ نسائی)

"مال حرام پر پلا ہوا گوشت (جسم) پروان نہیں چڑھتا بلکہ اس کا اصل ٹھکانا جہنم کی آگ ہے۔"

اِس باب میں اسلام کی پالیسی اپنے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہے۔ وہ ہر طرح کی ضرر رسانی کا سدِّ باب کرنے اور لوگوں کے درمیان باہمی تعاون کی اسپرٹ پیدا کرنے کے بنیادی مقاصد کو یہاں بھی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو دھوکہ دہی ایک طرف تو نفس کی کثافت ہے، ساتھ ہی یہ دوسروں کی ضرر رسانی کے بھی ہم معنی ہے۔ بالآخر اس طرح ایک ایسی فضا بن جاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اعتماد باہم کے بغیر کسی گروہ میں تعاون کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر دھوکہ دہی کا مآل یہی تو ہے کہ بلا کسی معقول اور جائز کوشش کے کچھ مال ہاتھ لگ جائے جب کہ اسلام کا عام اصول یہ ہے کہ کوئی ثمرہ بلا محنت نہیں، اور اسی طرح کوئی محنت نہیں جو رائگاں جائے اور اپنے ثمرہ سے محروم رہے۔

۲۔ اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کو اسلام دولت کمانے اور اس میں اضافہ چاہنے کا جائز طریقہ نہیں تسلیم کرتا۔

من احتکر فھو خاطی (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

"جس نے احتکار کیا وہ غلط کار ہے۔"

وجہ یہ ہے کہ احتکار صنعت و تجارت کی آزادی کا خون ہے۔ کیوں کہ اجارہ دار (Monopolist) کو یہ نہیں گوارا ہوتا کہ دوسرا بھی بازار میں اسی جیسا مال لائے یا اُسی جیسی مصنوعات تیار کرے۔ وہ تو بازار پر اپنا پورا کنٹرول چاہتا ہے تاکہ لوگوں سے من مانی قیمتیں وصول کر سکے اور نتیجۃً لوگوں کو ہر طرح

کی شدت اور تنگی کا شکار کر کے ان کا جینا دو بھر کر دے۔ وہ دوسروں کے لیے اس بات کے مواقع ختم کر دیتا ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح روزی کما سکیں یا اس تگ و دو میں اس سے زیادہ سرگرمی دکھا سکیں۔ چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتکار کرنے والا دولت کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور زائد سامان کو تلف کر دیتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص نرخ کو لوگوں پر مسلط کر سکے۔ یہ طرزِ عمل صریح طور پر سامانِ معیشت کے ان سماجی خزانوں کی بربادی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے فائدے کے لیے زمین میں پیدا کیا ہے۔

کسبِ مال کے اِس ذریعہ کا سدِّباب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دائرۂ دین سے خارج کرنے والا جرم قرار دے دیا:

من احتکر طعامًا اربعین یومًا فقد برئ من اللّٰہ وبری اللّٰہ منہ۔ (مسند امام احمدؒ)

"جس نے چالیس دن تک سامانِ غذا کو ذخیرہ کیے رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں نہ اللہ کو اس کی کوئی پرواہ"۔

ایسے شخص کو مسلمان تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جو جماعت کی دشمنی میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی ذاتی نفع اندوزی اور اِس طرح اپنے خزانہ میں اضافہ کی خاطر اجتماعی مصالح کو دانستہ مجروح کرتے ہوئے سماج میں مصنوعی طور پر خوف اور احتیاج پیدا کر دیتا ہے۔

۳۔ سُودی کاروبار بھی افزائشِ دولت کا ایک حرام ذریعہ ہے جسے اسلام واضح طور پر قابلِ نفریں قرار دیتا ہے۔ وہ اس کی خباثت واضح کرتے ہوئے اسے اپنانے والوں کو بدترین انجام کی خبر سُناتا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آلِ عمران: ۱۳۰)

"اے اہلِ ایمان دوگنا چوگنا کر کے سود نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرو تاکہ فلاح یاب ہو سکو۔"

یہاں مقصود صرف دوگنے، چوگنے سے روک کر سود کی معمولی شرحوں کو سندِ جواز عطا کرنا نہیں، یہ صرف احوالِ واقعی کا بیان ہے، اور جو کچھ (اُس وقت عرب میں) عملاً ہو رہا تھا اس کی تفصیل ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات سے واضح ہوتا ہے نفسِ سود کی ممانعت مقصود ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(البقرہ : ۲۵۷)

"سود خوار کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو شیطان (جنوں) نے اپنے اثر سے خبط الحواس بنا دیا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اِس بات کے قائل ہیں کہ بیع کا معاملہ بھی سودی معاملہ کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سودی معاملات کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اب جس کو اس کے رب کی نصیحت (اس باب میں) پہنچے اور وہ آئندہ سودی معاملات سے باز آجائے تو جو کچھ (سودی معاملہ) پہلے ہو چکا وہ اس کا ہے۔ اور اس باب میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد۔ اور جو اب بھی یہ حرکت کرے گا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔"

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِىَ

مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝

(البقرہ: ۲۷۸-۲۷۹)

"اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سودی مطالبات باقی رہ گئے ہیں ان کو اگر تم درحقیقت مومن ہو، چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تمھیں اللہ اور اس کے رسول ؐ سے جنگ کی وارننگ دی جاتی ہے۔ اگر تم توبہ کرو (اور سودی معاملات سے باز آجاؤ) تو تمھارے راس المال (Principal) تمھارے ہیں (وہ تم کو ملیں گے) نہ تو تم زیادتی کرو نہ تمھارے ساتھ زیادتی کی جائے گی"۔

سود کی مذمت اور اس کے اجتناب کی تلقین میں اسلام یہاں تک آگے جاتا ہے کہ اِس معاملہ میں جو کوئی کسی طرح بھی شریک ہو، چاہے اس کا دستاویز لکھنے والا ہو یا اس پر گواہی دینے والا، ان سب پر وہ لعنت بھیجتا ہے:

عن جابرٍ: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم آکل الربٰوا و موکلہ و کاتبہ و شاھدیہ و قال ھو سواء (مسلم)

"حضرت جابر رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے اور اس کی دستاویز لکھنے والے، اس پر گواہی دینے والوں سب پر لعنت بھیجی ہے اور فرمایا یہ سب برابر ہیں"۔

اِن تمام اُمور میں اسلام اُن بنیادی اُصولوں کے مطابق پالیسی اختیار کرتا ہے جو مال و دولت، اخلاق اور مصالح عامّہ کے سلسلہ میں اس کے سامنے ہیں۔ اس کے نزدیک دولت صاحبِ دولت کے ہاتھ میں ایک

امانت ہے اور وہ اس پر پوری جماعت کے مفاد کا نگراں مقرر کیا گیا ہے۔ اسے لوگوں کو نقصان پہنچانے اور ذاتی نفع کی خاطر اس ذمہ داری کو پسِ پشت ڈال دینے کا کوئی حق نہیں کہ وہ اُن کی ضرورت مندی کی گھڑی کا منتظر رہے۔ ان کی کمزور پوزیشن سے بے جا فائدہ اُٹھائے اور جو کچھ انہیں دیتا ہے اس سے بڑھ چڑھ کر معاوضہ وصول کرے۔ ضرورت ہر قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جس پر زندگی کی گاڑی کے آگے کھسکنے کا انحصار ہے تو کبھی علاج کے لیے دوا کی، یا حصولِ علم یا کسی اور ضروری کام کے لیے اخراجات کی۔ اس طرح یا تو یہ سارے کام یونہی پڑے رہ جائیں گے یا دولت مند لوگ ضرورتمندوں پر اپنا حکم چلائیں گے۔ اس کو تھوڑا دے کر اس سے بہت سا واپس لیں گے، اور اس طرح اس کی محنت کا حق دبا بیٹھیں گے۔ وہ بے چارہ محنت مشقت برداشت کیے جائے اور نتیجہ صرف یہ نکلے کہ یا تو ساری کی ساری کمائی سود ادا کرنے میں سود خوار کی نذر ہو جائے یا سال بسال قرض میں اضافہ ہوتا جائے۔

یہ زائد از ضرورت دولت جس سے صاحبِ مال فائدہ اُٹھاتا ہے —— دریں حالیکہ وہ کرتا کچھ نہیں بس راس المال (Principal) اس کا ہوتا ہے —— یہ دراصل خون اور پسینہ ہوتا ہے جس کو یہ کمال حیوانیت سے چاٹتا رہتا ہے اور بیٹھے ہی بیٹھے حریصانہ طور پر چوستا رہتا ہے۔

اسلام جو محنت کی عظمت و تقدس جتلاتا ہے اور اُسے ملکیت اور نفع کی اساس قرار دیتا ہے اِس بات کو روا نہیں رکھتا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والا فرد مال کا حق دار ٹھہرے، یا دولت، دولت کو جنم دے۔ دولت کو صرف محنت جنم دے سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر وہ مال حرام قرار پاتا ہے۔

اسلام فرد کی اخلاقی پاکیزگی اور جماعت میں باہم میل و محبت دونوں کو پوری اہمیت کے ساتھ سامنے رکھتا ہے۔ درحقیقت نہ تو کوئی صاحبِ خیر اور شریف انسان سود خواری میں ملوث ہو سکتا ہے نہ یہ ممکن ہے کہ کسی جماعت

میں سود خواری کی لعنت عام ہو جائے اور پھر بھی اس کے افراد میں باہم انس و محبت باقی رہ جائے۔ جو شخص مجھے ایک دینار صرف اس لیے دیتا ہے کہ اُسے دو دینار کر کے مجھ سے واپس وصول کر سکے وہ درحقیقت میرا دشمن ہے۔ میں کبھی اپنا دل اس کی طرف سے صاف نہیں رکھ سکتا اور نہ اس کی محبت میرے دل میں جگہ پا سکتی ہے۔ تعاون اسلامی سماج کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اور سود اس اصول کا دشمن واقع ہوا ہے۔ وہ اِس بنیاد کو ڈھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔

حرمتِ سود میں ایک اور حکمت مضمر ہے جو ہم پر آج دورِ جدید میں منکشف ہو رہی ہے اور غالباً کل تک سامنے نہ آئی تھی۔ وہ یہ کہ سود ایک ایسا عامل ہے جو سرمایہ میں بے حد و حساب اضافہ کرتا جاتا ہے۔ یہ اضافہ نہ تو کسی سعی و جہد کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کسی طرح کی محنت کا ثمرہ۔ سود کی یہ صفت ایسی ہے جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والے ایک طبقہ کو اس کا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ افزائشِ دولت کے سلسلہ میں تمام تر اسی ایک ذریعہ پر انحصار کر بیٹھیں۔ نتیجۃً اس طبقہ میں سستی و کاہلی، مسرفانہ عیاشی اور بدکرداری پھیل جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ ان محنت کشوں کے بل پر جو دولت کے محتاج ہوتے ہیں اور تنگی کے عالم میں مجبور ہو کر سُودی قرض لیتے ہیں۔ اِس طرح دو خطرناک اجتماعی امراض سر اُٹھاتے ہیں۔ سرمایہ میں بے حد و حساب اضافہ اور انسانیت کی بلند و پست دو طبقات میں روزافزوں تفریق جو کسی حد پر ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی۔ مزید برآں ایک نئے خطرہ کے طور پر ایک کاہل اور بے عمل طبقہ کا وجود جو بجز عیش و عشرت کچھ اور کرنے کا نام نہیں لیتا اور دنیا کی ساری نعمتیں بس بیٹھے ہی بیٹھے حاصل کرتا رہتا ہے۔ گویا اس کی دولت مزید دولت کے شکار کے لیے ایک جال ہے، ایسا جال جس میں شکار کو مغالطہ دینے کے لیے دانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ضرورت مندوں کے غول کے غول اس میں خود بخود پھنستے رہتے ہیں۔ ان کی ضروریات ان کو

دھکیل کر آگے بڑھاتی ہیں اور اپنے پیروں پر چل کر وہ اُس میں آ پڑتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ سود کھانا اسلامی تصوّرِ زندگی کے اس بنیادی اصول سے ٹکراتا ہے کہ مال اللہ کا ہے جس میں اس نے انسانوں کو نائب بنایا ہے ـــ ان شرطوں کے تحت جن کو نائب بنانے والا یعنی اللہ سبحانہٗ خود مقرر فرماتا ہے۔ نہ یہ کہ آدمی جو چاہے کرے۔

"سُودی نظام کی بنیاد یہ تصوّر ہے کہ انسانی زندگی اور اللہ سبحانہٗ کے ارادہ کے درمیان کوئی تعلق نہیں۔ انسان اصلاً اس زمین کا مالک ہے، اللہ سے کیے ہوئے کسی عہد کا پابند نہیں۔ نہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ کے احکام کی پیروی کرے۔ فرد پوری طرح آزاد ہے کہ جس طرح چاہے دولت کمائے، اس میں اضافہ چاہے اور اس سے لطف اندوز ہو۔ ان اُمور میں نہ وہ اللہ سے کیے ہوئے کسی عہد کا یا اس کی عاید کی ہوئی کسی شرط کا پابند ہے نہ اس کے لیے دوسرے افراد کے مصالح کا اعتبار و لحاظ ضروری ہے۔ اگر وہ اپنے ذاتی خزانہ میں کوئی اضافہ کر سکتا ہے تو اسے اس کی پروانہ ہونی چاہیے کہ اس کے نتیجہ میں لاکھوں افراد کو تکلیف ہوگی۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین بھی کبھی کبھی جزئی طور پر فرد کی اس آزادی میں مداخلت کرتے ہیں۔ مثلاً شرح سُود کی تحدید کر کے یا دھوکہ فریب، غصب، چوری، ملاوٹ، ایذا رسانی ...... وغیرہ کی بعض صورتوں کو ممنوع قرار دے کر۔ لیکن اس مداخلت کے حدود انسانوں کے اپنے اختیار اور ان کی خواہشات سے متعیّن ہوتے ہیں نہ کہ اللہ تعالیٰ کی سند رکھنے والے کسی مقرّرہ اصول کے تحت۔

مزید برآں اس کی تہہ میں یہ غلط اور فساد انگیز تصوّر کام کر رہا ہے کہ انسانی وجود کا آخری مقصود کسی نہ کسی طریقہ سے مال حاصل کر کے خواہشاتِ نفس کے مطابق اس سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد مال حاصل کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور اس راہ میں ہر اصول اور

دوسروں کی ہر مصلحت کو پامال کرتا چلا جاتا ہے۔ بالآخر اس سے ایک ایسا نظام جنم لیتا ہے جو انسانیت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے اور انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی ہر سطح پر انسانی زندگی کو چند سود خواروں کے فائدہ کی خاطر ناخوش و نامراد بنا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ نظام حیاتِ انسانی کو اخلاقی، نفسیاتی اور اعصابی اعتبار سے پست کر کے دولت کی گردش اور انسانی معیشت کی موزوں ترقی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ بالآخر اس کا انجام، دَورِ حاضر کے انجام کی طرح، یہ ہوتا ہے کہ پوری انسانیت پر حقیقی اقتدار اور عملی اختیار چند بدترین اور پست ترین گروہوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتا ہے۔ خلقِ خدا کے یہ بدترین افراد انسانیت کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتے، اس کے بارے میں کوئی بھی ذمہ داری نہیں محسوس کرتے۔ یہ نہ کسی عہد کا پاس رکھتے نہ کسی انسانی قدر کا لحاظ کرتے ہیں۔

یہ وہ افراد ہیں جو افراد کو بھی قرضے دیتے ہیں اور حکومتوں اور قوموں کو بھی۔ اپنے ملک میں بھی اور ملک کے باہر بھی۔ ساری انسانیت کی محنت کا اصل حاصل اور انسانوں کی خون پسینہ ایک کی ہوئی محنت کے نتائج چہار طرف سے کھنچ کر ان کے قدموں میں آتے ہیں —— اس سود کی شکل میں جس کے پیدا کرنے میں انھوں نے ذرا بھی محنت نہیں کی ہوتی ہے۔ انھیں صرف مال و دولت نہیں ملتی بلکہ نفوذ و رسوخ بھی حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ لوگ کسی اصول یا اخلاق کے حامل نہیں ہوتے، نہ کوئی اخلاقی یا دینی تصور رکھتے ہیں بلکہ دین و اخلاق اور اصول و مقاصد کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں، لہٰذا قدرتی طور پر اپنے اس زبردست اثر و نفوذ کو ایسے حالات پیدا کرنے، ایسے افکار کو فروغ دینے اور ایسے طریقے رائج کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جن کے طفیل ان کے لیے مزید نفع کمانا اور استحصال کرنا ممکن ہو سکے۔ اپنی حرص پوری کرنے اور ان کمینہ مقاصد کو حاصل کرنے کی راہ میں یہ کہیں بھی نہیں رُکتے۔ سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ انسانوں کے اخلاق خراب ہوں اور وہ لذت کوشی

اور شہوت پرستی کے دَلدل میں جا گریں کہ اس کی خاطر بہت سے لوگ اپنا آخری پیسہ بھی خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ پیسہ اُن کی جیبوں میں آ جاتا ہے جنھوں نے اسی کی خاطر یہ سارا جال پھیلا رکھا ہے۔ ساتھ ہی یہ لوگ دنیا کے معاشی امور و معاملات کو اپنے محدود مصالح کے مطابق جس طرح چاہتے ہیں چلاتے ہیں۔ خواہ اس کے نتیجہ میں کساد بازاری کے دَورے اور معاشی تلاطم نمودار ہوتے رہیں جن سے معاشیات کی دنیا خوب واقف ہے۔ ان کے اثر و رُسوخ کے نتیجہ میں صنعتی اور معاشی پیداوار تمام انسانوں کے مصالح کے مطابق انجام پانے کے بجائے ان مال دار سود خواروں کے مصالح کے مطابق انجام پاتی ہے جن کے ہاتھوں میں دنیا بھر کی دولت کی باگ ڈور آجاتی ہے۔

دورِ جدید میں ایک ایسی ٹریجڈی واقع ہوئی ہے جو اس بری شکل میں دورِ جاہلیت میں بھی نہیں پیش آئی تھی۔ وہ یہ کہ یہ سود خوار جو پرانے زمانہ میں بعض افراد اور مالی اداروں کی شکل میں پائے جاتے تھے اور آج جدید بینکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ ہوتے ہیں، دنیا کے غریب عوام کو اس مغالطہ میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ سودی نظام ہی قدرتی اور معقول نظام ہے۔ ایسا کرنا اس زبردست اثر و رسوخ کی بنا پر ممکن ہوا جو ان سود خواروں کو بین الاقوامی اداروں اور حکومتوں میں اور ان کے باہر بھی حاصل ہے۔ ساری دنیا کے رسل و رسائل اور تعلیم و تربیت کے نظام پر انہی لوگوں کا قبضہ ہے۔ اخبارات و رسائل، کتابوں اور ان کی تعلیم دینے والوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں، ریڈیو اسٹیشنوں اور سنیما گھروں، سب پر یہی چھائے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ سود خوار دنیا کے جن غریب عوام کا خون چوستے اور ہڈیاں چباتے ہیں انہی کے ذہنوں میں انھوں نے یہ خیال راسخ کر دیا ہے کہ معاشی ترقی کی واحد صحیح بنیاد سود ہے۔ اس کے سوا کسی اور بنیاد پر معاشی ترقی ممکن ہی نہیں اور مغرب کی ساری تمدنی ترقی اسی سودی نظام کی برکت سے عمل میں آئی

ہے۔ انھوں نے جمہورِ عالم کو باور کرایا ہے کہ جو لوگ سود کو ختم کرنا چاہتے ہیں وہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں۔ انھیں عملی حالات سے کوئی واقفیت نہیں اور ان کی رائے کی بنیاد صرف اخلاقی نظریات اور ایسے آئیڈیل کی طلب ہے جو واقعات کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ان لوگوں کی رائے کو اگر معاشی نظام میں دخل اندازی کا موقع دیا گیا تو یہ پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج جو لوگ سودی نظام پر تنقید کرتے ہیں ان کا مذاق وہ لوگ بھی اڑاتے ہیں جو خود اسی نظام کے مارے ہوئے اور اس کے ستم رسیدہ ہیں! ان بے چاروں کا حال بھی وہی ہے جو پوری عالمی معیشت کا ہے جسے دنیا کے سود خواروں کی ٹولیاں ایک خلافِ فطرت، غیر موزوں اور غلط راہ پر چلنے پر مجبور کیے ہوئے ہے جس کے نتیجے میں وہ مستقل طور پر کساد بازاری کے دوروں میں مبتلا رہتی ہے۔ اب اس معیشت کے لیے یہ ممکن نہیں کہ پوری انسانیت کے لیے سود مند ہو، بلکہ وہ بھیڑیوں کے ایک جھنڈ کا شکار بن کر رہ گئی ہے۔

سودی نظام خالص معاشی زاویۂ نگاہ سے بھی ایک ناقص اور مضر نظام ہے۔ اس کی مضرت یہاں تک بڑھ چکی ہے کہ اس کے مفاسد پر خود مغرب کے بعض علمائے معاشیات کو تنبہ ہو چکا ہے۔ جو خود اس کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں اور جن کی تعلیم و تربیت اسی زہریلی فضا میں ہوئی ہے جو دولتمندوں کی ٹولی تہذیب و ثقافت اور افکار و اخلاق ہر شعبہ میں پیدا کر چکی ہے اس نظام پر خالص معاشی زاویۂ نگاہ سے تنقید کرنے والوں میں پیش پیش جرمنی کے عالم معاشیات ڈاکٹر شاخت ہیں جو جرمنی کے رائش بینک (Reich Bunk) کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ دمشق میں ۱۹۵۳ء میں اپنے ایک لیکچر میں انھوں نے کہا تھا کہ وہ الجبرا کے ایک (لامتناہی) سلسلہ حساب کے ذریعہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ دنیا کی ساری دولت معدودے چند سود خواروں کے ہاتھوں میں کھنچ آنے والی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سود پر قرض دینے والا ہمیشہ

فائدہ حاصل کرتا ہے جب کہ قرض لینے والے کو کبھی نقصان ہوتا ہے اور کبھی فائدہ۔ ظاہر ہے کہ ساری دولت بالآخر اُس کے ہاتھوں میں آجائے گا جس کو ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔ الجبرا کے ذریعہ یہی بات ثابت کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ عملاً ایسا ہی ہو رہا ہے کیوں کہ آج دنیا کی بیشتر دولت کے اصل مالک چند ہزار افراد ہیں، باقی سارے اصحاب ملکیت اور کارخانہ دار جو بینکوں سے قرض لے کر کاروبار کرتے ہیں، اور ان کے مزدور وغیرہ سب انہی مال داروں کے تنخواہ دار ملازمین کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کی محنت کے ثمرات ان چند ہزار افراد کو ملتے ہیں۔

سود کی مضرت اسی پر موقوف نہیں۔ معاشی نظام کے سود پر قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور صنعت میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے درمیان تعلق کی نوعیت دائمی طور پر باہمی کش مکش اور ہار جیت کی بازی کی ہو جاتی ہے۔ سود خوار زیادہ سے زیادہ سود حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خاطر وہ سرمایہ کو روکے رہتا ہے تا آنکہ تجارت اور صنعت کی جانب سے اس کی طلب میں شدت پیدا ہو اور سود کی شرح بڑھ جائے۔ وہ اس شرح کو اسی طرح بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ تاجروں اور صناعوں کو یہ نظر آتا ہے کہ اتنی اونچی شرح سود پر سرمایہ حاصل کر کے سرمایہ کاری کرنے سے انھیں کوئی نفع نہیں حاصل ہو سکتا۔ کیونکہ سرمایہ کی پیداآوری اتنی زیادہ نہیں ہوگی کہ وہ سود ادا کرنے کے بعد اپنے لیے کچھ نفع بھی حاصل کر سکیں۔ جب یہ کیفیت رونما ہو جاتی ہے تو پیداواری سرگرمیاں جن میں کروڑوں افراد مشغول ہوتے ہیں سست پڑ جاتی ہیں اور ان میں لگا ہوا سرمایہ گھٹنے لگتا ہے۔ کارخانے اپنی پیداوار کم کر دیتے ہیں، مزدور بے روزگار ہو جاتے ہیں، اور قوتِ خرید گھٹ جاتی ہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچتی ہے اور سود خوار یہ دیکھتے ہیں کہ سرمایہ کی طلب گھٹ گئی یا ختم ہو گئی تو وہ مجبوراً سود کی شرح کم کرتے ہیں۔ پھر تاجر اور صناع از سرِ نو سرمایہ کے طلب گار ہوتے ہیں اور زندگی کی گاڑی پھر سے خوش حالی کی طرف رواں ہوتی

ہے۔ اسی طرح دنیا میں کساد بازاری اور خوش حالی کے دَورے یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں اور انسانیت بے زبان بیلوں کی طرح اس کولھو میں جُتی رہتی ہے۔

سارے صارفین سود خواروں کو براہِ راست ایک محصول ادا کرتے ہیں۔ کیوں کہ اربابِ صنعت و تجارت جو سرمایہ استعمال کرتے ہیں ان کا سود صارفین ہی سے وصول کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں اس سود کا اضافہ کر دیتے ہیں، اور اس طرح سود کا بار ساری خلقِ خدا پر تقسیم ہو جاتا ہے، تاکہ بالآخر سود کی پوری رقم سود خواروں کو ادا کی جا سکے! حکومتیں مالی اداروں سے ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے اور دوسری سماجی خدمات انجام دینے کے لیے جو قرضے لیتی ہیں ان کے سود بھی ان حکومتوں کے شہری اَدا کرتے ہیں۔ حکومتیں مجبور ہیں کہ مختلف محاصل میں اضافہ کر کے ان قرضوں کو مع سود ادا کرنے کا اہتمام کریں۔ اس طرح ہر فرد سود خواروں کو یہ "جزیہ" ادا کرنے میں شریک ہے۔ معاملہ یہیں پر نہیں ختم ہو جاتا بلکہ ان قرضوں کا انجام سامراجیت ہے۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر سامراجی جنگیں بھی لڑی جاتی ہیں!"[1]

اسلام کے نزدیک قرض سب یکساں ہیں، خواہ اُسے ضروریات میں خرچ کرنے کے لیے لیا جائے یا پیدا آور کاموں پر لگانے کے لیے۔ کیوں کہ اگر قرض مصارف کے لیے لیا گیا ہے اور اُس سے غرض یہ ہے کہ قرض لینے والا اپنی ضروریات میں خرچ کرے تو اس کو اصل کے علاوہ کچھ اور دینے پر مجبور کرنا کسی طرح قرینِ انصاف نہیں۔ یہی بہت ہے کہ وہ گنجائش ہوتے پر اصل کو واپس کر دے۔ اگر قرض پیدا آور کاموں میں لگانے کے لیے لیا گیا ہے تو اس پر جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ ثمرہ دراصل اس محنت کا ہے جو وہ خود کرتا ہے نہ کہ اس

---

[1] فی ظلال القرآن، جلد ۳۔ صفحات ۷۳ تا ۷۶۔

مال کا جو اس نے قرض لیا۔ کیوں کہ سرمایہ بلا محنت نفع آور نہیں ہوتا اور اسلام میں اصل اہمیت محنت ہی کو حاصل ہے۔ سرمایہ کے ذریعہ نفع کمانے کی صورت صرف شرکت و مضاربت ہے جس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال رہتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر سود کو کسی حال میں جائز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اپنی ضروریات کے لیے قرض چاہنے والے کو قرض دینا بہر حال لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اب اگر قرض لینے والے نے قرض لیا اور پھر تنگی ہی میں مبتلا رہا تو اُسے "فراخی تک مہلت" دی جائے گی (فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ)۔ میری رائے میں یہ صیغہ حکم کے لیے ہے کیوں کہ یہ شرط اور جواب شرط کی شکل میں وارد ہوا ہے۔

وَاِنْ کَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰی مَیْسَرَةٍ ط

(البقرہ: ۲۸۰)

"اگر (مقروض) تنگ حالی میں مبتلا ہو تو اسے فراخی تک مہلت ملنی چاہیے۔"

اس صیغہ کے استعمال سے حکم دینا مقصود ہے نہ کہ صرف ترغیب اور اظہار پسندیدگی۔ اس حکم کے پہلو بہ پہلو اسلام نرمی برتنے اور سہولت سے پیش آنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

رَحِمَ اللّٰہُ رجلاً سمحاً اذا باع واذا اشترٰی واذا اقتضٰی۔ (بخاری، ترمذی)

"اس شخص پر خدا اپنے رحم و کرم کی بارش کرے جو خرید و فروخت میں خوش دلی اور سلیقہ مندی برتتا ہے اور قرض کا تقاضا کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے۔"

قرض کے تقاضے میں نرمی اور شرافت مقروض کی عزت و آبرو کو محفوظ

رکھنے کا باعث بنتی ہے اور اس کے دل میں قرض دینے والے کی محبت کے لیے جگہ بناتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ ابھارتی ہے کہ حتی الامکان ادا کرنے کی پوری کوشش کرے۔ آپؐ نے فرمایا:

مَن سرّہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفّس عن معسرٍ او یضع عنہ۔

(مسلم)

"جو قیامت کے روز کرب و اضطراب سے بچنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ تنگ حال مقروض کی مشکلات رفع کرے یا اس سے جو مطالبہ ہو اس میں کچھ کمی کر دے۔"

اور یہ کہ:

مَن انظر معسرًا او وضع لہٗ اَظلّہٗ اللہ یوم القیامۃ تحت ظلّ العرش یوم لا ظلّ الا ظلّہٗ۔

(ترمذی)

"جس نے تنگ حال مقروض کو مہلت دی یا اس کے لیے کچھ کمی (اصل قرض میں سے) کر دی اسے اللہ قیامت کے دن عرش پاک کے سایہ تلے لے لیگا جب کہ اس دن بجز اس کے سایہ کے کوئی سایہ میسّر نہ ہوگا۔"

اس کے بالمقابل اسلام قرض دار کا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ قرض کو ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے تاکہ اِس طرح اپنی ذمّہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو جائے اور قرض دینے والے کے احسان کا بدلہ واپسی کے معاملہ میں وعدہ کا سچا ثابت ہو کر ادا کر دے۔ نیز اس کے اس طرزِ عمل کا ایک مزید فائدہ یہ بھی ہوگا کہ معاملات میں لوگوں کا باہمی اعتماد بڑھ جائے گا۔

من اخذ اموال الناس یرید اداءھا ادی اللہ

عنه ومن اخذ ها يريد اتلافها اتلفه الله۔

(بخاری)

"جو ادا کرنے کی نیت سے لوگوں کا مال (قرض) لیتا ہو اللہ اس کی طرف سے ادائیگی کا بندوبست فرمائے گا۔ اور جو اڑانے پڑانے کی نیت سے لیتا ہے اللہ اس کو بربادی کے حوالہ کر دے گا"

چنانچہ جو ادا کرنے کی نیت سے قرض لے گا وہ ضرور کوشش کرے گا کہ کچھ کمائے اور روزی حاصل کرے۔ اور عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ دُھن کا پکا عزّو شرف کمانے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے، اور جو اڑاتے پڑانے کے خیال سے لے گا وہ دوسروں کے مال پر عیش کرنے ہی میں ٹھاٹ جمائے گا اور سعی و جہد چھوڑ، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے گا۔ نتیجہ میں کاہلی اور سُستی اُسے آدبوچے گی۔ اس کی ہمّت جواب دے دے گی اور بالآخر وہ ناکامی اور تباہی سے دوچار ہو گا۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

مطل الغنی ظلمٌ (رواۃ الخمسۃ)

"مال رکھنے والے کا واپسی قرض میں خواہ مخواہ تاخیر کرنا صریح ظلم ہے۔"

ایک شخص نے دریافت کیا کہ "اللہ کے رسولؐ! آپؐ کا کیا خیال ہے اگر مَیں راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں تو اللہ میری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: "ہاں، بشرطیکہ تو خالصۃً للہ لڑ رہا ہو، صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے اور اُلٹے قدم بھاگتے ہوئے نہیں بلکہ آگے کو اقدام کرتے ہوئے مارا جائے۔" پھر آپؐ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا اپنا سوال دُہرانا! اس نے سوال کو دُہرایا۔ آپؐ نے فرمایا: "ٹھیک ہے، لیکن قرض نہیں بخشا جائے گا۔ جبریل مجھے یہ بات بتا گئے ہیں۔"[1] گویا صاحبِ قدرت مقروض کے سر سے قرض کا بار اِس طرح بھی نہیں ہٹ سکتا کہ وہ جہاد کرے،

---

[1] مسلم، ترمذی، نسائی۔

راہِ خدا میں مخلصانہ طور پر صبر و ثبات کے ساتھ لڑے اور پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہوا نہیں جرأت مندانہ اقدام کی حالت میں مارا جائے۔ کیوں کہ قرض کا تعلق دوسروں کے حقوق سے ہے جو اس کے ذمہ ہیں۔ صرف اللہ کا حق نہیں۔ یہ اس شکل میں جب کہ وہ ادائے قرض پر قادر ہو۔ رہا معذور اور عاجز آدمی، تو وہ زکوٰۃ میں سے ایک حصہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے " انما الصدقت للفقراء ..... والغرمین "۔ اس کو ادائے قرض کی خاطر صدقہ کے طور پر کچھ دینا بھی مناسب ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نے (کاروباری نقطۂ نظر سے) پھلوں کا ایک باغ خریدا۔ آفاتِ سماوی کے نتیجہ میں باغ تباہ ہو گیا۔ بے چارہ بہت مقروض ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس شخص پر صدقہ کرنے کی تلقین کی۔ چنانچہ لوگوں نے صدقہ کیا۔ لیکن اتنا مال نہ جمع ہو سکا کہ پورا قرض ادا کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا کہ: جو مِل جائے اُسے لے لو، اب اور زیادہ تمھیں نہیں مل سکتا (ترمذی)

جب پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں کافی مال جمع ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلا قدم اُٹھایا۔ اب آپؐ نے یہ دستور بنا لیا کہ مقروض افراد کے مرنے کے بعد ان کے ذمہ کے قرضے بیت المال سے ادا کر دیا کرتے:

عن ابی هريرة رضی الله عنه قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يؤتى بالرجل المتوفى عليه الدين فيسأل: هل ترك لدينه قضاء؟ فان حدث انه ترك وفاءً صلّى عليه، و الّا قال للمسلمين صلّوا على صاحبكم۔ فلمّا فتح الله عليه الفتوح قام فقال: انا اولى بالمؤمنين

من انفسهم فمن مات علیہ دین ولم یترک وفاء، فعلینا قضاءہ، ومن ترک مالاً فلورثتہ۔

(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: مقروض افراد کی میت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی جاتی تو آپ دریافت کرتے: کیا اس نے اپنے قرض کی ادائیگی کے بقدر مال چھوڑا ہے۔ اگر جواب ملتا کہ اس نے اِس قدر مال چھوڑا ہے کہ قرض ادا کیا جا سکے۔ تب تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ورنہ مسلمانوں سے کہہ دیتے کہ اپنے ساتھی کی نمازِ جنازہ ادا کریں۔ جب اللہ نے آپؐ کو متعدد فتوحات عطا کیں تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ: مَیں مسلمانوں کا ان کی نسبت بھی زیادہ قریبی اور سرپرست ہوں، پس جو اِس حال میں انتقال کر گیا کہ اس پر قرض ہے اور ادائیگی کے لیے اُس نے کافی مال نہیں چھوڑا تو اس قرض کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے ورثاء کا حق ہے۔"

ان نظائر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ بے کس و مجبور کی مدد کی جائے اور اسے ادائے قرض میں سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اِسی طرح وہ اِس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق ملے۔ اسلام معاملہ کے ہر پہلو کا لحاظ رکھتا ہے۔ جملہ مصالح کا تحفظ عمل میں لاتا ہے اور حقوق و فرائض کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔

صَرف کی راہیں

اوپر ہم نے ان حدود پر گفتگو کی ہے جو اسلام نے باہمی لین دین کے ذریعہ افزائشِ دولت کے سلسلہ میں عاید کی ہیں۔ جہاں اِسلام نے کسبِ مال کے لیے

یہ حدود متعین کی ہیں وہیں وہ مال کے صرف کو بھی یونہی بلا کسی ضابطہ کے نہیں چھوڑ دیتا۔ چنانچہ صاحبِ دولت کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی کہ جس حد تک چاہے مال کو نہ صرف کرے اور روکے رکھے یا جہاں جس طرح چاہے اُسے خرچ کرتا رہے۔ گو اس طرح کا تصرّف ایک شخصی مسئلہ ہے لیکن اسلام میں فرد کی یہ حیثیت نہیں تسلیم کی گئی ہے کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں من مانی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ بلاشبہ اُسے یک گونہ آزادی حاصل ہے لیکن چند متعین حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاید ہی کوئی انفرادی فعل ہو جس کا تعلق دوسروں سے کچھ بھی نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ تعلق بالکل واضح اور قریبی نہ ہو۔

اسلام کو نہ تو اسراف کی حد تک بڑھا ہوا خرچ کرنا پسند ہے نہ کنجوسی کی حد تک ہاتھ روکنے کو وہ صحیح سمجھتا ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں ہی طریقے بالآخر اس فرد اور پوری جماعت کے حق میں نقصان کا باعث بنتے ہیں:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ (اسراء: ۲۹)

"اپنے ہاتھ کو گلے میں باندھ کر سکیڑ نہ لے، نہ اُسے پوری طرح پھیلا کہ (بعد میں تو) ہدفِ ملامت بن کر تنگ دستی کے عالم میں بیٹھ رہنے پر مجبور ہو جائے۔"

يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝

(الاعراف: ۳۱)

"اے بنی آدم! ہر مسجد میں تم اپنے کو زیب و زینت دینے والے اسباب کو ساتھ رکھو اور کھاؤ پیو لیکن اسراف میں نہ مبتلا ہو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔"

صرف سے دست کشی کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نفس جائز حد تک بھی آرام وراحت نہ اٹھا سکے، دریں حالیکہ اسلام ضروری قرار دیتا ہے کہ فرد شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات کو بھی آرام پہنچائے اور مختلف لذائذ سے لطف اندوزی کا موقع دے - اسے یہ بات چنداں گوارا نہیں کہ لوگ ان چیزوں سے بھی محروم رکھے جائیں جو حرام نہیں قرار دی گئی ہیں - کیوں کہ زندگی کو معقول اور خوش گوار ہونا چاہیے - ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں حسن وجمال پیدا ہو سکے اور اسے بلا اسراف اور لہو ولعب میں مبتلا ہوئے شاداں وفرحاں اور شاداب وشگفتہ رکھا جا سکے - اسلام نے ترکِ لذائذ، زہد وتقشّف اور پاکیزہ وطیّب نعمتوں سے خود کو محروم کر لینے کا حکم کبھی نہیں دیا -

چنانچہ مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اسلام انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مناسب حد تک زیب وزینت اختیار کرے - اس آیت کے بعد ہی قرآن استفہام انکاری کے انداز میں کہتا ہے :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(الاعراف : ۳۲-۳۳)

"ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں ؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں

کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔ اِس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام — خواہ کھُلے ہوں یا چھُپے — اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمھیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔"

اسلام چاہتا ہے کہ تمام لوگ، بڑے چھوٹے اور امیر و غریب، سب زندگی کو خوش گوار بنانے والی نعمتوں سے فائدہ اُٹھائیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خطاب کا رُخ "بنی آدم" کی طرف ہے۔ اب اگر وہ کبھی صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتا ہے تو اس کے معنیٰ زہد اور ترکِ دنیا کے نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب شدائد و مصائب آن پڑیں تو اُن کے دُور ہونے یا دُور کیے جانے تک آدمی بجائے گھبرانے کے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ رہے۔ ایسے مواقع کے علاوہ فرد ہمیشہ اس بات کا مکلّف ہے کہ حلال چیزوں سے متمتع ہوتا رہے، اور جماعت پر اس بات کی ذمّہ داری عاید کی گئی ہے کہ اپنے سارے افراد کے لیے یہ چیزیں مہیّا کرنے کی کوشش کرے اور اُنھیں اُن چیزوں سے محروم نہ رکھے جن سے مستفید ہوتے رہنے کی دعوت ان کو اللہ تعالےٰ نے دی ہے۔

اِسی لیے اسلام نے فقراء کو — یعنی اُن لوگوں کو جو نصابِ زکوٰۃ سے کم مال رکھتے ہیں — زکوٰۃ میں سے ایک حصّہ کا مستحق قرار دیا ہے۔ جس کا منشاء صرف یہی نہیں کہ ان کو کفاف (ناگزیر ضرورت) کے بقدر میسر آجائے۔ کیونکہ اتنا تو ان کے پاس ہونا ہی ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کو رزق میں مزید فراخی نصیب ہو۔ یہ اس لیے کہ اسلام صرف بقدرِ کفاف کا طالب نہیں بلکہ وہ

زندگی سے متمتع ہونے پر اُبھارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ متمتع ہونے کا سوال کفاف کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے اور اس سے زائد ملنے پر ہی ممکن ہے۔

جب اسلام فقیر کو زکوٰۃ میں سے حصّہ دیتا ہے تاکہ اس مزید مال سے وہ اپنے نفس کی آسائش کا کچھ سامان کرے اور ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی سامانِ حیات سے لطف اندوز ہو سکے، تو صاحبِ مال کو بدرجۂ اولیٰ خرچ کرنا چاہیے۔ اسے ایک معقول حد تک سامانِ حیات فراہم کرنا چاہیے اور اپنے نفس کو پاکیزہ اشیاء سے محروم نہ کرنا چاہیے ـــــ اور ظاہر ہے کہ پاکیزہ اشیاء بکثرت اور بے شمار ہیں ـــــ تاکہ زندگی میں نکھار پیدا ہو۔ وہ حسن و جمال سے آراستہ ہو اور (اس خوش گوار فضا میں) انسان کی طبیعت ضروریات سے ماوراء بلندیٔ تفکیر اور لطافتِ احساس کی فضا میں سانس لے سکے، اور اس کارخانۂ تخلیق اور عالمِ موجودات پر غور و فکر نیز (اس صنّاعی کے) کمال اور جمال کی بلندیوں کا شعور پیدا کرنے والے تدبّر میں محو ہو سکے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا اٰتاك الله نعمة فليُرَ اثر نعمة الله عليك وكرامته (ابوداؤد۔ نسائی)

"جب اللہ تجھے نعمت سے نوازے تو ضروری ہے کہ اِس انعامِ الٰہی کا اثر تیرے (ظاہر کے) اوپر دیکھا جا سکے گا۔"

گویا آپؐ کے نزدیک باوجود قدرت کے خستہ حال اور مسکین صورت بنا رہنا اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری، بلکہ ان کے انکار کے ہم معنیٰ ہے جسے اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔

یہ ساری گفتگو ایک زاویۂ نظر سے تھی۔ مال کے گردش میں آنے اور صَرف کیے جانے سے روکنے کو اسلام ایک اور زاویہ سے بھی دیکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس کا اِس طرح روکے رہنا اس کے حقیقی عمل کو معطّل کر دیتا ہے۔ جماعت کا مفاد متقاضی ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ گردش کرتی رہے تاکہ زندگی ہر طرح

پھلے پھولے، پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو، محنت کاروں کے لیے وسائلِ کار فراہم ہوں اور انسانیتِ عامّہ کو تعمیری سرگرمیوں کے پورے پورے مواقع میسر آئیں - مال کا روکے رکھنا اس پورے نظام کو معطّل کر دیتا ہے لہٰذا وہ اسلام کے نزدیک حرام ہے - اس سے مال دار فرد کے مخصوص مفادات اور سماج کے عام مصالح دونوں کا خون ہوتا ہے -

اسراف دوسری انتہا کا نام ہے، اور وہ بھی فرد اور جماعت دونوں کے لیے مہلک ہے - یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں مال صَرف کرنا، خواہ سارے کا سارا مال اس مصرف میں کام آجائے، اسراف نہیں کہلاتا - اوپر وہ حدیث گزر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ اگر آپؐ کے پاس پہاڑ برابر سونا ہوتا تو بھی اُسے کُل کا کُل اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے اور دو قیراط بھی بچا کر نہ رکھتے - اسراف کا اطلاق اُس فضول خرچی پر ہوتا ہے جو اپنے نفس کی خاطر کی جائے اور اسلام کو اِسی سے بحث ہے -

اِن معنیٰ میں اسراف اِسی عیش پرستی کا نام ہے جسے اسلام سخت ناپسند کرتا ہے - اس کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ مال امیروں ہی کے درمیان گردش کرتا رہے - تاکہ ایسا نہ ہو کہ کثرتِ مال لوگوں کو عیش و عشرت میں مبتلا کر دے - اسلام عیش پرستی کو فرد و جماعت دونوں کے لیے شر و فساد کا منبع قرار دیتا ہے - چنانچہ اس کے نزدیک یہ ایک ایسا مُنکر ہے جسے مٹا دینا جماعت کا فرض ہے - اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اسی کے سبب خود کو ہلاکت کے منہ میں جا ڈالے گی -

ایسی بہت سی آیات اور متواتر حدیثیں ہیں جو دو ٹوک الفاظ میں عیش کوشی کو ناپسندیدہ اور حرام قرار دیتی ہیں - یہ واضح طور پر بتاتی ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک یہ انتہائی گھناؤنے قسم کا فعل حرام ہے - وہی اسلام

جو لوگوں کو زندگی کی پاکیزہ نعمتوں سے لُطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا اور اس بات کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اِنھیں حلال قرار دیا مگر لوگ انھیں اپنے اوپر حرام کر لیں، وہ اسلام جو زندگی کو صرف باقی رکھنے اور خستہ حال بنا کر رکھنے کی بجائے اسے حسین، خوشگوار اور دل پسند بنا کر گزارنے پر اُبھارتا ہے، وہی اسلام اسرافِ بے جا اور عیش پرستی کو اتنی ہی شدت کے ساتھ ناپسندیدہ اور نامرغوب قرار دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن بتاتا ہے کہ عیش پرست کم ہمت، کمزور اور بزدل ہوتے ہیں:

وَإِذَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ ءَامِنُوا۟ بِٱللَّهِ وَجَٰهِدُوا۟ مَعَ رَسُولِهِ ٱسْتَـْٔذَنَكَ أُو۟لُوا۟ ٱلطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوا۟ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ ٱلْقَٰعِدِينَ ۝ (التوبہ: ۸۶)

"اور جب کوئی سورۃ اِس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ کو مانو اور اس کے رسولؐ کے ساتھ مِل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحبِ مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انھیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔"

اسلام ان صاحبِ قدرت لوگوں کو مجاہدین کی صفوں سے پیچھے ہٹ جانے اور بیٹھ رہنے پر کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا پورا اندازہ اس وقت ہو گا جب ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ اسلام جہاد کو کتنی اہمیت دیتا ہے، اس کی کتنی ترغیب دلاتا ہے اور جو لوگ خود سے اس کی طرف بڑھیں ان کو کتنا بلند مرتبہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بغزوٍ مات علیٰ شعبۃٍ من النفاق۔ (مسلم۔ ابوداؤد۔ نسائی)

"وہ شخص یک گونہ نفاق کی حالت میں مرا جس نے موت تک

اللہ کی راہ میں جنگ نہ کی، اور نہ اس کے دل میں اس کا کوئی ارادہ پیدا ہوا۔"

یہ چنداں تعجب کی بات نہیں کیوں کہ عیش پرست کاہل اور سہولت پسند ہوتا ہے۔ نہ اس میں مردانگی باقی رہتی ہے نہ قوتِ ارادی۔ اس نے محنت و مشقت کی عادت نہیں ڈالی، لہٰذا اس کا جذبۂ دروں سرد پڑ جاتا ہے اور اس کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں۔ جو چیز اس کو عزیز ہے وہ شہوانی لذائذ ہیں۔ جہاد کے سلسلہ کی مشقتیں اسے کچھ عرصہ کے لیے ان حیوانی لذّتوں سے محروم کر دیتی ہیں۔ اور ایسا آدمی بجز ان بے حیا اور فحش و ناکارہ اقدار کے زندگی میں کسی اور چیز کی قدر و قیمت سے آشنا ہی نہیں ہوتا۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تاریخِ انسانی میں مترفین کا عمل کیا رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اِس ہدایت کی راہ میں روڑا ثابت ہوئے ہیں جو ان کے اور ان کے کمزور زیر دستوں کے لیے آئی ہے۔ جس سماج میں کچھ لوگ عیش پرست ہوں وہاں زیر دستوں کا ایک گروہ بھی ضروری ہے تاکہ وہ ان کی خوشامدیں کر کے ان کے کبرِ نفس کو تسکین دے۔ محنت کر کے اُن کی خواہشات پوری کرے اور ان کی چاکری کرتا ہوا کیڑے مکوڑوں کی طرح فنا ہو جائے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ٥ (سبا: ٣٤)

"ہم نے جب کبھی کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس چیز کا انکار کرتے ہیں جسے لے کر تم بھیجے گئے ہو۔"

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَیَشْرَبُ مِمَّا

تَشْرَبُوْنَ ۝ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝ (المومنون: ۳۳-۳۴)

"اور اس کی قوم کے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا اور جنھیں ہم نے دنیا کی زندگی میں خوشحال بنایا تھا، یہ کہا: یہ تو تمھارے ہی جیسا ایک آدمی ہے اور کچھ نہیں، جو تم کھاتے ہو وہی یہ بھی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی یہ بھی پیتا ہے۔ اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کی تب، تو تم واقعی بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔"

وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۝ (الاحزاب: ۶۷-۶۸)

"اور انھوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کی پیروی کی اور انھوں نے ہمیں راہِ راست سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! ان (سرداروں اور بڑے) لوگوں کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت کر۔"

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ عیش پرستوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے وہ ان کی نرالی سہل پسندانہ اور مریضانہ زندگی ہے۔ یہ اپنی خواہشات و مرغوبات سے چمٹے رہتے ہیں۔ ان کو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے خدمت گزاروں اور نمک خواروں کا ایک گروہ چاہیے۔ دین و ایمان ان کو ان مرغوبات کے ایک بڑے حصّہ سے محروم کر دیتا ہے اور دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے چند راہیں متعیّن کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جائز حدود ان کے لیے بہت کم اور غیر تشفّی بخش ثابت ہوتی ہیں۔ جس پر ان کی مریضانہ ذہنیت اور بے لگام خواہشات قانع نہیں ہوتیں۔ پھر اسی پر بس نہیں اسلام تمام انسانوں

کی قدر و قیمت بالا کرتا ہے اور ان عیش پرستوں کے لیے مفلس و کمزور طبقات پر اس طرح کی حکومت جتانے کا موقع نہیں باقی رہتا جس کے سبب وہ ان کے آلۂ کار اور غلام بنے رہتے ہیں۔ اسلام ان اوہام و خرافات اور بے بنیاد قصوں کو بھی ختم کر دیتا ہے جن کے ذریعہ یہ لوگ اپنے گرد ایک ہالہ بنا لیتے ہیں اور جاہل و گمراہ اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے سماج میں انھیں استحصال کے لیے ایک مؤثر حربے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے یہ لوگ ہر ہدایت اور ہر روشنی کے دشمن ہوتے ہیں۔ عیش پرستی ضمیرِ انسانی پر جو اثر ڈالتی ہے اور لذّت پرستی کی زندگی انسان کے جذباتِ عالیہ کو جس جمود و خمود کا شکار بنا دیتی ہے وہ اِن خرابیوں کے علاوہ ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ ءَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ۝ (الفرقان: ۱۷-۱۸)

"اور وہی دن ہو گا جب کہ (تمھارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے ان معبودوں کو بھی بُلائے گا جنھیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پُوج رہے ہیں۔ پھر وہ ان سے پوچھے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟ وہ عرض کریں گے: پاک ہے آپ کی ذات، ہماری یہ مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں، مگر آپ نے ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا حتّٰی کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔"

یعنی عیش و عشرت کے سامان جو عرصۂ دراز تک میسّر رہیں اور آبا و اجداد

سے ورثہ میں ملے ہوں انسان کو خدا سے غافل کر دیتے اور ناکارہ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ لوگ "بُور" ہو گئے، قرآن نے گویا ان کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اِس میں بڑے گہرے معانی پوشیدہ ہیں۔ "بُور" ان قحط زدہ زمینوں کو کہتے ہیں جو کچھ پیدا کر کے نہیں دیتی ہیں۔ ان لوگوں کے دل، ان کی طبیعتیں اور ان کی پوری زندگی اِسی طرح سخت اور بنجر ہو جاتی ہے، اب اس میں زندگی کی کوئی بھی حرکت نہیں محسوس کی جا سکتی۔

اللہ کا رسولؐ مُترَفین کے گھروں کو شیطان کے ٹھکانے قرار دیتا ہے کہ انہی سے فساد پھُوٹتا ہے اور وہیں پر سر اُٹھاتا ہے:

تکون ابل للشیاطین و بیوت للشیاطین فاما ابل الشیطان فقد رایتھا، یخرج احدکم بنجیبات معہ قد اسمنھا فلا یعلوا بعیرًا منھا، ویمر باخیہ قد انقطع فلا یحملہ، واما بیوت الشیطان فلا اراھا الا ھذہ الا قفاص التی تستر النّاس بالدیباج۔ (ابوداؤد)

"شیطان کے اونٹ بھی ہوتے ہیں اور گھر بھی۔ شیطان کے اونٹوں کو مَیں نے خود دیکھا ہے۔ تم میں سے کوئی اپنے ساتھ بہترین قسم کے اونٹ لیے نکلتا ہے جسے اُس نے کِھلا پلا کر خوب فربہ کیا ہوتا ہے۔ وہ نہ تو کسی اونٹ پر خود سوار ہوتا ہے نہ اپنے اس بے سہارا بھائی کو اس پر سوار کراتا ہے جو اسے راستہ میں ملتا ہے۔ ایسے شیطان کے گھر تو میرے نزدیک وہ پنجرے ہیں جو لوگوں کو دیباج سے ڈھنگ دیتے ہیں۔"[1]

---

[1] یہ حدیث ابوداؤد (کتاب الجہاد، باب الجنائب میں آئی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اونٹوں کو جن پر ان کے مالکوں کو سواری کی چنداں ضرورت نہ تھی جب کہ کتنے ہی اکیلے مسافر سواری سے محروم تھے، شیطان کے اونٹ قرار دیا۔ اور آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شان دار موٹریں چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلہ میں اِدھر اُدھر دوڑا کرتی ہیں جب کہ ہزاروں افراد کو ٹرام کے ٹکٹ کے لیے چند پیسے بھی میسّر نہیں ہوتے اور سینکڑوں افراد تو ایسے ہیں جن کو چلنے کے لیے دو پاؤں بھی نہیں میسّر۔ کیوں کہ ان کی ٹانگیں حادثوں کی نذر ہو چکیں۔ رہے وہ گھر جنھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان "پنجروں" سے تعبیر کیا تھا جو (اپنے اندر رہنے والے) لوگوں کو دیباج (کے پردوں) سے ڈھنک دیتے ہیں، تو وہ آج بھی نظر آتے ہیں۔ آج اِن گھروں میں عیش و عشرت کے ایسے ایسے سامان پائے جاتے ہیں جو اُس زمانے کے انسان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھے۔

عیش و عشرت کا باعث ہلاکت ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے، کیوں کہ متاعِ دنیا کی فراوانی اور ان میں انہماک سے انسان میں اِتراہٹ پیدا ہوتی ہے:

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا

(قصص: ۸۵)

"اور ہم نے کتنی ہی ایسی بستیاں غارت کر دیں جو اپنی معاشی حالت پر اترانے لگی تھیں، تو یہ ہیں ان کے گھر بار جو ان کے بعد بہت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکن حدیث کے الفاظ اُس سے کچھ مختلف ہیں جو مصنف نے لکھے ہیں۔ ابو داؤد کی شرح عون المعبود میں قفص سے ہودج مراد لیا گیا ہے۔ اقفاص وہ ہودج ہیں جن پر ریشمی پردے ڈالے جاتے تھے۔ جیسا کہ مصنف کی عبارت سے واضح ہے۔ وہ اس کی شرح کچھ اور ہی کرتے ہیں۔ (مترجم)

ہی کم آباد ہو سکے۔"

عیش پرستی آخرت میں عذابِ شدید سے دوچار کراتی ہے۔ کیوں کہ اس کے سبب آدمی طرح طرح کے گناہوں سے آلودہ ہوتا ہے:

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۝ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۝ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۝ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَىِٕذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝

(الواقعہ: ۴۱ تا ۴۸)

"اور بائیں جانب والے، کیسے بائیں جانب والے؟ بادِ سموم اور کھولتے پانی میں۔ دھوئیں کے سایہ میں۔ جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ اچھا۔ یہ لوگ اِس سے پہلے (دنیا میں) خوش حال لوگ تھے۔ یہ لوگ گناہِ عظیم (یعنی شرک و کفر) پر مُصر تھے۔ اور کہا کرتے تھے: کیا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈی بن چکے ہوں گے تو ہمیں پھر اٹھایا جائے گا؟ اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی!"

لیکن یہ دُنیوی تباہی اور اُخروی عذاب صرف عیش پرست فرد پر نہیں آتا بلکہ اس پوری جماعت کو گھیر لیتا ہے جو مترفین کے وجود کو برضا و رغبت گوارا کرتی رہتی ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا[1] مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝

(بنی اسرائیل: ۱۶)

---

[1] یہاں اَمَرنا کے معنیٰ اکثرنا (تعداد بڑھا دینا) کے ہیں (مصنف)۔ جیسا کہ ہمارے ترجمہ سے ظاہر ہے ہمارے لیے مصنف کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے (مترجم)۔

"جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اِس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اُسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔"

جماعت میں عیش پرستوں کا وجود، جماعت کا اُسے بخوشی گوارا کر لینا، اور اپنی خاموشی کے ذریعہ گویا اس کی اجازت دینا، عیش و عشرت کے اسباب کا ازالہ کرنے کی طرف توجہ نہ کرنا، اور عیش پرستوں کو فساد پھیلانے کے لیے آزاد چھوڑ دینا، یہ اپنی عین فطرت کے اعتبار سے ایسے اسباب و عوامل ہیں جو بالآخر لازماً تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں۔ اِس آیت میں ارادہ کے یہی معنیٰ ہیں۔ یعنی مقدمات کے متحقق ہو جانے پر اُن کے نتائج مرتب کرنا اور اسباب فراہم ہو جانے پر ان کے مسبّبات کو بروئے کار لا دینا، جیسا کہ حیات و کائنات میں ازل سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ رہا ہے۔

اپنے اندر نمودار ہونے والے اِس منکر کے بارے میں جماعت ہی کو جواب دِہ قرار دیا گیا ہے۔ کسی جماعت میں عیش پرستی کا وجود لازماً اس کے اندر منکر کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔ اوپر ہم نے یہ بتایا ہے کہ فاضل قوّت اپنا کوئی نہ کوئی مصرف تلاش کر لیتی ہے۔ ان مترفین کے پاس فاضل مال، فالتو جسمانی طاقت اور خالی وقت ہوتا ہے۔ جس میں نہ اُنھیں کوئی کام ہوتا ہے نہ کسی کام کی فکر۔ یہ سب مختلف طرح کی قوّتیں ہیں۔ یہ سب صاحبِ ثروت نوجوان مرد اور عورتیں جن کو جوانی، دولت کی فراوانی اور وقت کی ارزانی سبھی کچھ میسّر ہے، فسق و فجور نہ کریں گے تو کیا کریں گے؟ ان کو وقت، مال اور جسم کی ان فاضل قوتوں کے کچھ مصرف تلاش کرنے پڑتے ہیں اور اکثر یہ مصارف بہت پست قسم کے ہوتے ہیں جو زمانہ اور ماحول کے اعتبار سے مختلف رُوپ دھارتے رہتے ہیں۔ لیکن پستی و ذلت اور ظاہری و معنوی خباثت ایک قدرِ مشترک کے طور پر

ان میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

دوسری طرف نفع اندوزوں، استحصال کرنے والوں اور حاجت مندوں کا گروہ ہوتا ہے۔ جس میں بردہ فروش، مسخرے اور ان عیش پرستوں کے حاشیہ نشین اور خدمت گزار شامل ہوتے ہیں جو اپنے قول وعمل سے بے حیائی، فحاشی، عیش پرستی اور سہل پسندی کی اشاعت میں ہمہ دم مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی اِن تمام اعلیٰ قدروں کی توہین کرتے رہتے ہیں جو مترفین کے اِس گروہ کے مفاد ومذاق سے ٹکراتی ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ مرض زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل جاتا ہے اور یہ خرابیاں بالآخر ایک ایسی فضا بنا دیتی ہیں کہ فحاشی اور بے حیائی پوری قوم میں عام ہو جاتی ہے۔ ایک بے قید اباحیت ہر کس وناکس کا شعار قرار پاتی ہے۔ لوگوں کے نہ صرف جسم بلکہ دماغ بھی کسل واضمحلال کا شکار ہو کر ناکارہ ہو جاتے ہیں۔ اور رُوحانی اور معنوی اقدار کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے۔ جب سماج اِن پستیوں میں جا گرتا ہے تو اللہ کی سنّت کے مطابق وہ تخریب وہلاکت کا مستحق قرار پا جاتا ہے۔ اور اللہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی نظر میں جرمِ عیش پرستی کی تاریخ اور اس کا انجام۔ یہ خرابی پہلے چند انفرادی کرداروں میں نمودار ہوتی ہے۔ پھر جب جماعت اسے خاموشی سے گوارا کر لیتی ہے تو یہ فساد اپنے نتائج سامنے لاتا ہے اور یہ جماعت کے جسم کو اپنے نامبارک اثرات سے رِستے ہوئے ناسوروں میں بدل دیتا ہے۔ مقدمات پر نتائج کے مرتّب ہونے اور فراہمیٔ اسباب پر مسبّبات کے ظہور میں آنے کے قاعدہ کے تحت یہ فساد جماعت کو بالآخر ہلاکت کے غار میں دھکیل دیتا ہے:

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ؕ (الاحزاب : ۶۲)

"تم اللہ کے طریقہ کو بدلتا نہ پاؤ گے۔"

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیش پرستی اور مفلسی کے حدود کیا ہیں اور ان کے مابین اعتدال و توسط کی راہ کیا ہے؟

جب ہم اسلام کے اوّلیں دورِ عروج کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ خستہ حالی اور مفلسی کا دور دورہ ہے اور فقر و فاقہ عام ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ریشمی لباس پہننے سے منع فرمایا:

من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسہ فی الاٰخرۃ۔ (بخاری)

"جس نے دنیا میں ریشم (کا کپڑا) پہنا اسے آخرت میں ریشمی لباس، نہ نصیب ہو گا۔"

اور علی کرم اللہ وجہہٗ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قسّی[1] اور زرد رنگ کا کپڑا پہننے اور سونے کی انگوٹھی سے روک دیا تھا۔ یہ ممانعت صرف مردوں کے لیے تھی۔ عورتوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کے زیور مباح قرار دیے گئے۔ اگرچہ رسول اللہؐ نے یہ نہیں پسند کیا کہ آپؐ کی صاحبزادی فاطمہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سونے کے زیور پہنیں۔ لیکن یہ ایک خصوصی حکم تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کے لیے دیا تھا، عام لوگوں کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں قرار دیا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ کہنا حرام کو حلال کر دینے کے مترادف نہ ہو گا کہ اگر قوم کے احوال و ظروف کا تقاضا نہ ہو تو اسلام بذاتِ خود خستہ حالی اختیار کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رنگین اور شوخ کپڑے اور ریشمی یا نقش و نگار سے آراستہ لباس پہننے سے مرد کی امتیازی شان گھٹتی

---

[1] ایک سوتی کپڑا جس پر ابریشم سے بنے ہوئے نقش و نگار ہوتے تھے۔ یہ کپڑا عرب میں مصر سے درآمد کیا جاتا تھا۔

اور اس کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ ایسے لباس سے ان میں عیش کوشی اور سہل پسندی راہ پاتی ہے۔ خاص طور پر زمانۂ جہاد میں اور یا ایسی شکل میں جب کہ جماعت کے اقتصادی حالات ایسے بناؤ سنوار کی اجازت نہ دیتے ہوں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو یہ بھی نہیں گوارا کہ یہ خستہ حالی بھونڈے پن اور بدسلیقگی تک جا پہنچے کہ آدمی اپنے لباس سے لاپرواہی برتنے لگے اور اُسے دیکھ کر وحشت ہو۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ آپؐ نے ایک شخص کو دیکھا کہ پریشان حال ہے اور اس کے بال پراگندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"کیا اسے اپنے سر کے (بال) دُرست کرنے کے لیے کوئی چیز نہ مل سکی؟"

ایک بار آپؐ نے ایک شخص کو مَیلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا:

"کیا اسے اپنے کپڑے دھونے کے لیے کچھ بھی نہ مِل سکا؟"

ابُوالاَحْوَص اَلْجُشَمی نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں دیکھا کہ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپؐ نے دریافت کیا کہ:

"کیا تمھارے پاس کچھ مال ہے؟"

مَیں نے جواب دیا: "ہاں"۔

آپؐ نے فرمایا: "کس قسم کے مال؟"

مَیں نے عرض کیا کہ: "اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر قسم کے مال دے رکھے ہیں، اُونٹ ہیں اور بکریاں ہیں"۔

آپؐ نے فرمایا:

اذا اٰتاک اللہ مالاً فلیرا اثر نعمتہ وکرامتہ علیک۔ (ابوداؤد۔ نسائی)

"جب تجھے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو ضروری ہے کہ تیرے
(ظاہر کے) اوپر اس کی نعمت اور کرم فرمائی کا اثر بھی محسوس کیا جائے۔"
نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
انّ اللہ طیّب، یحب الطیب، نظیف یحب النظافۃ
کریم یحب الکرم، جود یحب الجود، فنظّفوا افنیتکم
ولا تشبّھوا بالیھود۔ (ترمذی، بسندِ حسن)
"اللہ پاک ہے اور پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے۔ صاف ستھرا
ہے اور صفائی ستھرائی اسے پسند بھی ہے۔ خود کریم ہے اور رحم و
کرم کو محبوب رکھتا ہے۔ سخی ہے اور اسے سخاوت پسند ہے۔
لوگو! تم بھی اپنے جسموں کو صاف ستھرا رکھا کرو اور یہود کی طرح
(گندے) نہ ہو جاؤ۔"

اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو زیب و زینت اختیار کرنے اور حلال و پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہرا لینے کا جو حکم دیا ہے اس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اِن تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ سماج کی عام معاشی سطح ہی عیش کوشی اور بدحالی کی حدیں متعین کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بڑے بڑے ملکوں کا فاتح بنایا، دولتِ عامّہ میں اضافہ ہوا اور معاشی سطح بلند ہوئی تو ان کے لباس بھی بدل گئے اور وہ ان نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہونے لگے جن سے وہ پہلے نہیں لطف اندوز ہوتے تھے۔ کسی نے بھی ان کو ایسا کرنے پر ملامت نہیں کی اِلّا یہ کہ یہ کبھی حدِ معقول سے تجاوز کر گئے ہوں (اور تب ان پر تنقید کی گئی ہو)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

کل ماشئت والبس ماشئت ماخطئتک اثنتان
اسرفٌ او مخیلۃ۔ (بخاری)
"جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پہنو، بشرطیکہ اسراف اور اِترانا ہٹ

اِن دونوں چیزوں سے بچے رہو۔"

لیکن ساتھ ہی ہم اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اسلام کو زندگی کی جو رَوش پسند ہے اور جسے وہ عام طور پر رائج دیکھنا چاہتا ہے وہ سادگی کی رَوش ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کا امتیازی نشان یہ قرار دیتا ہے کہ ان کا نفس مادّی ساز و سامان سے بے نیاز ہو اور وہ اس ساز و سامان کے غلام بن کر نہ رہ جائیں:

تعس عبد الدرھم، تعس عبد الدینار، تعس عبد القطیفہ۔ تعس وانتکس، واذا شیک فلا انتقش۔

..... (بخاری)

"درہم کا پرستار ہلاک ہو، دینار کا بندہ ہلاک ہو، مخملی شال کا غلام ہلاک ہو۔ ہلاک ہو اور منہ کے بل گرے۔ پھر جب اسے کانٹا چُبھے تو وہ بھی نہ نکالا جائے۔......."

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ مادّی ساز و سامان سے بے نیازی کے ساتھ اس کو برتنے میں میانہ روی اختیار کی جائے۔ قلبِ مسلم کا ذوق و احساس راہِ اعتدال کو خوب جانتا ہے۔

فریضۂ زکوٰۃ

اب ہمارا موضوعِ بحث زکوٰۃ ہے جو ارکانِ اسلام میں سے ایک ایسا رُکن ہے جو واضح طور پر اجتماعی واقع ہوا ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام پر گفتگو میں زکوٰۃ کی بحث مرکزی مقام کی حامل ہے۔

زکوٰۃ مال میں عاید ہونے والا ایک حق ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عبادت ہے اور اپنے دوسرے پہلو کے اعتبار سے ایک اجتماعی فریضہ۔ عبادات اور اجتماعی مسائل کے باب میں اسلام کے مخصوص طرزِ فکر کو سامنے رکھتے ہوئے

ہم زکوٰۃ کو ایک تعبّدی اجتماعی فریضہ قرار دیں گے۔ اِسی لیے اسے زکوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں طہارت اور نمو کے۔ یہ عبارت ہے ضمیر کی اِس پاکیزگی سے جو حقِ واجب کی ادائیگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ قلب کی اس صفائی کا نام ہے جو حبِّ ذات اور حرص و بخل کے طبیعی خصائص سے بلند و بے نیاز ہو جانے پر میسّر آتی ہے۔ مال ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے اور اپنی ملکیت ہر ایک کو محبوب ہوتی ہے۔ نفس اسے دوسروں کی خاطر صرف کرے تو اسے پاکیزگی اور برتری حاصل ہوتی ہے۔ اِسی میں اس کی جِلا مضمر ہے۔ زکوٰۃ مال کی وہ پاکیزگی ہے جو اسے حقِ مال اَدا کرنے اور اس طرح حلال قرار پا جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کا یہی تعبّدی پہلو ہے جس کے سبب اسلام کے لطیف احساس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اہلِ ذمّہ اور اہلِ کتاب سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ اس نے اِس کے عوض ان پر جزیہ عاید کیا ہے تاکہ وہ اِس کے ذریعہ ریاست کے عام اخراجات میں شریک ہو سکیں۔ مگر جبراً کسی اسلامی عبادت کے پابند نہ قرار دیے جائیں اِلّا یہ کہ وہ خود اِسے اختیار کر لیں۔

زکوٰۃ سماج کا ایک حق ہے جو فرد پر واجب ہوتا ہے تاکہ ضرورت مند طبقوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور بسا اوقات ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی انھیں کچھ سامانِ زندگی فراہم کیا جا سکے۔ اس طرح اسلام کسی حد تک اپنے اس اصول کو عملی جامہ پہناتا ہے جو آیۂ کریمہ "كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ" میں بیان ہوا ہے۔ اسلام کو انسانوں کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا ناگوار ہے۔ اس نے یہ اصول طے کر دیا ہے کہ فرد اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی قوّتِ بازو کے بل پر اپنی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے اور اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا ہو تو اُسے سماج کے مال میں سے کفاف دیا جائے۔

اسلام کو انسان کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا کیوں نہیں گوارا؟ اِس لیے

کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان کو اس کی مادّی ضروریات سے فارغ کر کے اُن بلند تر مقامات و منازل کی طرف توجّہ کرنے کا موقع فراہم کرے جو مقامِ انسانیّت اور اس خصوصی شرف و امتیاز کے شایانِ شان ہیں جو اللہ نے بنی آدم کو عطا فرمایا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل : ۷۰)

"ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ان کو خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔"

اللہ نے انسانوں کو یہ بزرگی عقل و جذبات اور جسمانی ضروریات سے بلند تر مقاصد کی طرف روحانی میلانات دے کر عملاً عطا فرمادی ہے۔ اب اگر انسانوں کو ضروری سامانِ زندگی اس قدر بھی میسّر نہ ہو کہ انھیں اِن روحانی میلانات اور فکری بلند پردازیوں کے لیے کچھ وقت مِل سکے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کی یہ بزرگی ان سے چھین لی گئی اور وہ جانوروں کے مقام پر واپس چلے گئے، بلکہ اس سے بھی نیچے۔ کیوں کہ جانوروں کو تو عموماً کھانے پینے کو مِل جاتا ہے۔ بہت سے جانور مست ہو کر کلیلیں کرتے پھرتے ہیں اور کتنی ہی چڑیاں پیٹ بھر لینے کے بعد زندگی کی رعنائیوں پر خوشیاں مناتی اور چہچہاتی پھرتی ہیں۔

ایسا شخص جسے اپنے کھانے پینے کی فکر اتنا مشغول رکھے کہ بلند مقامِ انسان کے شایانِ شان افکار و تصورات کی طرف توجّہ کرنا تو کُجا، اتنی فرصت اور اس قدر فراغِ ذہن بھی نہ میسّر ہو جتنا چرند و پرند کو حاصل ہے، نہ تو انسان کہلانے کا مستحق ہے نہ اللہ کے نزدیک شرف و امتیاز کا حامل۔ یہ صورتِ حال کہ آدمی اپنا سارا وقت صرف کر دینے اور ہر ممکن کوشش کر لینے کے باوجود بقدرِ کفایت

روزی نہ حاصل کر سکے، اس کے حق میں سمِّ قاتل ہے۔ یہ اُسے اس مقام سے بہت نیچے گرا دیتی ہے جو اللہ تعالےٰ نے اس کے لیے پسند فرمایا ہے۔ یہ صورتِ حال اس سماج کے حق میں بھی مہلک ہے جس کے افراد اس میں مبتلا ہوں۔ یہ ایک گِرا ہُوا سماج ہے جو اللہ کی طرف ہونے والی عزّت و بزرگی کا مستحق نہیں، کیوں کہ اس نے ارادۂ الٰہی کی خلاف ورزی کی ہے۔

انسان اللہ کی زمین میں اس کا نائب ہے۔ اللہ نے اسے منصبِ نیابت اِس لیے عطا فرمایا ہے کہ وہ اِس زمین پر حیات کو نشو ونما بخشے، اسے ترقی دے، اسے شاداب و شگفتہ بنا کر رکھے اور پھر اِس شادابی اور حسن سے لطف اندوز ہو کر ان ساری نعمتوں پر اللہ کا شکر بجا لائے کہ سب اُسی کی عطا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کی پوری زندگی روٹی کی نذر ہو جائے چاہے یہ روٹی اس کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو تو وہ ان بلند مقاصد کو کبھی نہ حاصل کر سکے گا۔ پھر وہ زندگی کتنی گِری ہوئی زندگی ہے جس میں انسان عمر بھر کوشش کے باوجود اپنی ضروریات بھی نہ پوری کر سکے۔

اسلام کو یہ بات بہت ناپسند ہے کہ امّت کے مختلف افراد کے درمیان اتنا تفاوت پایا جائے کہ کچھ لوگ تو عیش و عشرت کی زندگی گزاریں اور دوسرے لوگ خستہ حال اور پریشان رہیں، اور یہ خستہ حالی، مفلسی، فاقہ کشی اور کپڑوں بغیر ننگے رہنے کی حد تک جا پہنچے۔ ایسی قوم مسلمان نہیں کہی جا سکتی۔ اللہ کا رسولؐ فرماتا ہے:

ایّما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائعاً فقد برئت منھم ذمّۃ اللہ۔ (مسند امام احمدؒ۔ حدیث نمبر ۴۸۸۰ بحوالہ جدید ایڈیشن۔ مرتبہ احمد محمد شاکر)۔

"جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اِس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا وعدہ ختم۔"

نیز آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ:

لا یؤمن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب

لنفسہ۔ (متفق علیہ)

"تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں جب تک

وہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی نہ

پسند کرے۔"

اسلام امّت کے مختلف افراد کے درمیان اتنے زیادہ تفاوت کو کیوں نہیں پسند کرتا؟ اس کا جواب حسد و کینہ کے ان خطرناک جذبات میں مضمر ہے جو سماج کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں۔ اس کا جواب اس بے جا امتیاز، حق تلفی اور سنگ دلی میں مضمر ہے جو قلب و ضمیر کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ اتنا تفاوت ہونے کا مطلب ضرورت مندوں کو چوری اور غصب کرنے یا عزّتِ نفس اور خودداری سے ہاتھ دھوکر انتہائی ذلّت وخواری میں مبتلا ہو جانے پر مجبور کرنا ہے۔ یہ انسانوں کو پستی کی طرف لے جانے والے عوامل ہیں جن سے اسلام سماج کو بچائے رکھنا چاہتا ہے۔

اسلام نہیں چاہتا کہ دولت قوم کے مال دار افراد کے درمیان گردش کرتی رہے اور عوام کی اکثریت کو خرچ کرنے کے لیے مال نہ میسّر ہو کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم کی زندگی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے اور روزگار اور آمدنی کی سطح گِر جاتی ہے۔ اکثر لوگوں کے ہاتھوں میں مال ہوگا تو وہ اسے ضروریاتِ زندگی کی خریداری میں صَرف کریں گے، اشیاء کی طلب بڑھے گی، پیداوار میں اضافہ ہوگا اور قابلِ کار افراد کے لیے مکمل روزگار حاصل ہو سکے گا۔ اس طرح محنت، پیدائشِ دولت اور صَرفِ دولت کا عمل اپنے قدرتی انداز پر جاری رہ کر مفید نتائج سامنے لا سکے گا۔

زکوٰۃ کا مقصد یہی ہے۔ شارع نے اسے ایک مالی فریضہ قرار دیا ہے

جو اپنے مستحقین کا ایک قانونی حق ہے، نہ کہ زکوٰۃ نکالنے والوں کا ایک احسان"
اس کا نصاب اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ سارے مال دار لوگ اس کی ادائیگی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ وہ حد جس سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں عاید ہوتی، بیس مثقال سونا ہے۔ جو ہمارے سکّے میں تیس پاؤنڈ کے برابر ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ مالک مقروض نہ ہو۔ یہ رقم ضروریات کے علاوہ اس کے پاس فاضل بچ رہی ہو اور اس پر پورا ایک سال گزر چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ جو آدمی خود ہی زکوٰۃ کا مستحق ہو اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ زرعی پیداوار اور پھلوں کی زکوٰۃ موسم موسم وصول کی جاتی ہے اور فصل تیار ہونے پر واجب ہوتی ہے۔ سامانِ تجارت کی زکوٰۃ سونے یا چاندی میں اس کی جو قیمت آتی ہے اس کے حساب سے لی جاتی ہے۔ مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرحیں بھی مقرر ہیں اور ان میں وہی تناسب ملحوظ رکھا گیا ہے جو نقد سرمایہ کی زکوٰۃ میں پایا جاتا ہے۔ (یعنی چالیسواں حصّہ)۔ رِکاز میں پانچواں حصّہ واجب ہے۔ البتہ رکاز کی مختلف قسموں کے احکام کے بارے میں اختلاف ہے کہ اِن کے مالک زمین کے مالک ہوں گے یا قوم ہو گی۔

قرآن کریم کی صراحت کے بموجب مالِ زکوٰۃ کے مستحق یہ ہیں:

فُقراء

یہ وہ لوگ ہیں جو نصاب سے کم مال رکھتے ہیں۔ یا اگر صاحبِ نصاب ہیں تو اتنے مقروض ہیں کہ قرضہ وضع کرنے کے بعد صاحبِ نصاب نہیں رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کچھ نہ کچھ مال تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ مال ناکافی ہوتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر فرد کو بقدرِ کفایت مال ملے اور جہاں تک ممکن ہو انھیں سامانِ دُنیا سے مستفید ہونے کی خاطر قدرِ کفایت سے زیادہ بھی حاصل ہو۔

مساکین

وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ قدرتی طور پر یہ لوگ فقراء سے زیادہ مستحق ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ آیت میں فقراء کے ذکر کو ان پر مقدم رکھنا اِس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فقراء کے پاس جو تھوڑا مال ہوتا ہے وہ کافی نہیں اور ان کا حال بھی گویا مساکین جیسا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اسلام بقدرِ ضرورت کفالت کی فراہمی پر قانع نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ فراہم کرنا چاہتا ہے۔

عاملینِ زکوٰۃ

یعنی وہ لوگ جو اس کی تحصیل عمل میں لاتے ہیں۔ ان کو ان کے کام کے معاوضہ کے طور پر کچھ دیا جاتا ہے خواہ یہ خود صاحبِ مال ہوں۔ گویا (ان کا حصّہ) ایک طرح کی تنخواہ ہے اور اس کا تعلق نظامِ محنت و اجرت سے ہے نہ کہ ضروریات کی تکمیل سے۔

مؤلفۃ القلوب

یعنی وہ لوگ جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں ان کو مال دے کر ان کی ہمت افزائی کرنا اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف لانا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مرتدین کے خلاف فوج کشی کے بعد سے اِس مصرف پر خرچ کرنا بند کر دیا گیا ہے۔ کیوں کہ پھر اسلام کو اتنا غلبہ و استحکام حاصل ہو گیا کہ اسے مال کے ذریعہ تالیفِ قلوب کی کوئی حاجت نہیں باقی رہ گئی۔ اس کے باوجود کہ قرآن کی ایک آیت واضح طور پر ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کا مستحق قرار دیتی ہے اور حضرت عمرؓ نے اِس سلسلہ میں تصرّف کرنے میں کوئی حرج نہ محسوس کیا۔

گردنیں چھڑانے میں

یعنی اِن مکاتب غلاموں کی مالی امداد جو اپنے آقاؤں سے ایک متعیّن رقم کے عوض آزادی حاصل کر لینے کا معاہدہ کر لیں تاکہ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں۔

قرض دار

جن کے اوپر ان کی پونجی سے کہیں زیادہ قرض ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ قرض کسی گناہ کے کام میں نہ لیا گیا ہو۔ مثلاً عیش پرستی وغیرہ۔ ان کو زکوٰۃ سے حصّہ دینا ایک طرف تو قرض سے نجات کا ذریعہ بنے گا۔ دوسری طرف ان کو صاف ستھری باعزت زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔

فی سبیل اللہ

یہ ایک عام مَد ہے جس کی عملی شکلیں حالات ہی متعین کر سکتے ہیں۔ مجاہدین کی تیاری، بیماروں کا علاج، جو لوگ خود سے تعلیم نہ حاصل کر سکتے ہوں ان کی تعلیم کا بندوبست، غرض یہ کہ وہ سارے کام جو مصالح مسلمین کی خاطر مفید اور ضروری ہوں اس مَد کے تحت آجاتے ہیں۔ اس کے اندر اتنی وسعت ہے کہ مختلف حالات میں سارے ہی اجتماعی کام اس کے تحت آجاتے ہیں۔

مسافر

جو غریب الوطنی کے باعث اپنے مال سے فائدہ نہ اُٹھا سکتا ہو اور اس وقت اس کا ہاتھ خالی ہو۔ اس تعریف کے تحت آج کل کے مہاجرین بھی آجاتے ہیں جو جنگ، غارت گری اور ظلم و جور کے باعث بے گھر ہو جاتے ہیں، جو کچھ مال و دولت اُن کے پاس تھا وہ وہیں چھوٹ جاتا ہے اور اب ان کے لیے اس سے استفادہ ممکن نہیں رہ جاتا۔

واضح رہے کہ اسلام ان مستحقین کو زکوٰۃ میں سے حصّہ پانے کا حق اسی وقت دیتا ہے جب کہ یہ کسب و مال کی کوشش میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ اور اس کے باوجود ان کا کام نہ چلے۔ اس پالیسی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عزتِ نفس اور خودداری کو سب سے اہم چیز سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ اس کا اہتمام کرتا ہے کہ ہر فرد کو روزی کا ایک ایسا ذریعہ حاصل رہے جو اس کے اپنے اختیار میں ہو اور جس کے سلسلہ میں وہ کسی کا، یہاں تک کہ سماج کا بھی، ماتحت و دست نگر

بننے پر نہ مجبور ہو۔ اِسی لیے وہ لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ محنت کریں اور اِس طرح مدد لینے سے مستغنی رہیں۔ اِسی لیے اس نے جماعت کی اوّلین ذمہ داری قرار دی ہے کہ ہر فرد کے لیے روزگار فراہم کرے۔ ایک آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگنے آیا۔ آپؐ نے اسے ایک درہم عنایت فرمایا کہ اس سے ایک رسّی خرید لے۔ جنگل سے لکڑیاں چُنے اور انھیں باندھ کر لے آئے اور اس طرح اپنی قوّتِ بازو کی کمائی پر گزر بسر کرے۔ آپؐ نے فرمایا:

لان یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب علیٰ ظہرہ فیبیعہٗ خیرٌ لہٗ من ان یسأل الناس اعطوہ اومنعوہ۔ (بخاری و مسلم)

"یہ بات کہ تم میں سے کوئی رسّی لے، لکڑیاں چن کر اپنی پیٹھ پر لاد لائے اور اسے فروخت کر کے (گزر بسر کرے) اس سے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ ان کا جی چاہے اسے دیں جی چاہے نہ دیں۔"

زکوٰۃ کی رقم سے دی جانے والی امداد آخری اجتماعی بچاؤ ہے۔ یہ در حقیقت ایسے افراد کے لیے سماجی تحفّظ ہے جو باوجود کوشش کے کچھ نہ کما سکیں یا ضرورت سے کم یا بقدرِ ضرورت ہی حاصل کر سکیں۔ زکوٰۃ کے ذریعہ یہ مقصد بھی حاصل کیا جاتا ہے کہ دولت تمام افرادِ معاشرہ کے درمیان گردش کرتی رہے تاکہ پیداوار، محنت اور صَرف کے درمیان سرمایہ کی گردش موزوں طریقہ پر انجام پاتی رہے۔ یہاں اسلام بیک وقت معاملہ کے دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خواہش کہ ہر فرد اپنی طاقت بھر کام کرے اور سماجی امداد کا سہارا لے کر بے کار وقت گزاری نہ کرے، اور دوسری طرف اِس بات کا لحاظ کہ ضرورت مند کو بقدرِ ضرورت مدد دے کر ضروریاتِ حیات کا بار اس کے سر سے ہلکا کر دیا جائے اور اُسے ایک صاف ستھری اطمینان و سکون

کی زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کر دیے جائیں۔ ساتھ ہی وہ اس کے ذریعہ سرمایہ کے موزوں طریقہ پر گردش کرتے رہنے کا اہتمام بھی کرتا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

زکوٰۃ تعاون اور کفالتِ باہمی پر مبنی اُس معاشرہ کی بنیاد ہے جسے اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں بھی سودی نظام کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

آج زکوٰۃ کے بارے میں ہمارا تصوّر مسخ ہو گیا ہے۔ وہ بدبخت نسلیں زکوٰۃ کی حقیقت کے صحیح ادراک سے محروم ہیں۔ جنھوں نے اسلامی نظام کو واقعات کی دنیا میں قائم نہیں دیکھا ہے اور براہِ راست مشاہدہ سے یہ بات نہیں سمجھ سکی ہیں کہ یہ نظام ایمانی تصوّر، ایمانی تربیت اور ایمان پر مبنی اخلاق پر قائم ہوتا ہے اور نفسِ انسانی کو ایک مخصوص سانچہ میں ڈھال دیتا ہے۔ پھر اس نظام کے ہر شعبہ میں صحیح افکار و تصوّرات، پاکیزہ اخلاق و عادات اور اعلیٰ طور طریقے جاری ہوتے ہیں۔ جاہلی نظام کے بالمقابل جس کی بنیاد سُود پر ہے اسلام اپنے نظام میں زکوٰۃ کو بنیاد کی حیثیت دیتا ہے۔ اس نظام میں انفرادی سعی و جہد اور سود سے پاک باہمی تعاون کے ذریعہ زندگی نمو پاتی ہے اور معیشت کی ترقی عمل میں آتی ہے۔

جن بدقسمت نسلوں کو انسانیت کے اس اعلیٰ تصوّر کا عملی تجربہ نہیں ان کو زکوٰۃ کی اس صحیح شکل کا شعور نہ حاصل ہو سکا۔ یہ نسلیں سود پر مبنی مادّی نظام کے زیرِ سایہ پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ انھیں حرص و آز، بخل و کم ظرفی، درندوں جیسی باہمی مسابقت اور اس خود غرضانہ انفرادیت ہی کا تجربہ ہُوا، جو عوام کے ضمیروں پر بھی حکمراں ہے، جس کے تحت ضرورت مندوں کو بھی سود کے ذلیل ذریعہ کے سوا کسی اور صورت سے مال نہیں مِل سکتا۔ جن انسانوں کے پاس جمع شدہ مال نہ ہو وہ اس نظام میں بے سہارا زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ سہارے کی صورت صرف یہ نکلی کہ اپنے مال کا ایک حصّہ ادا کرکے

انشورنس کے سودی کاروبار میں شرکت کریں۔ تجارت اور صنعت کو بھی اس وقت تک کاروباری سرمایہ نہیں مل سکتا جب تک وہ اسے سود پر نہ حاصل کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بدنصیب نسلوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا انتظام ممکن ہی نہیں، اور زندگی کی گاڑی صرف سود کے پہیوں پر چل سکتی ہے!

زکوٰۃ کے بارے میں لوگوں کا تصور اتنا بگڑ گیا ہے کہ وہ اسے معمولی درجہ کی انفرادی خیرات سمجھنے لگے ہیں جس کی بنیاد پر دورِ حاضر میں کوئی اجتماعی نظام نہیں قائم ہو سکتا۔ مگر غور کرنے کی بات ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعہ حاصل ہونے والی مجموعی رقم کی مقدار کتنی ہو گی جب کہ اس کی شرح قومی سرمایہ اور اس کے منافع کی کل مقدار کی ڈھائی فی صد ہے[1] مزید برآں اسے ادا کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جنھیں اسلام نے ایک خاص سانچے میں ڈھال کر اپنے قوانین اور تلقین و ترغیب کے ذریعہ تربیت دی ہو گی۔ جو ایک ایسے اجتماعی نظام کے زیر سایہ پروان چڑھیں گے جس کی بلندی کا تصور بھی ان ذہنوں کے لیے دشوار ہے، جنھوں نے اس کے زیر سایہ زندگی نہ گزاری ہو۔ پھر اسے ایک مسلم ریاست ایک لازمی حق کے طور پر وصول کرے گی نہ کہ خیرات کے طور پر۔ اس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی جماعت کے ہر اس فرد کی کفالت کرے گی جس کے ذاتی وسائل اس کے لیے کافی نہ ہوں۔ اس طرح ہر فرد کو یہ اطمینان حاصل ہو گا کہ اس کی اولاد کی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل بہر حال یقینی ہے۔ ساتھ ہی ریاست ادائے قرض سے عاجز مقروض افراد کی جانب سے ان کے قرضے زکوٰۃ کی مد سے ادا کرے گی خواہ یہ قرض کاروباری اغراض کے لیے ہوں یا غیر کاروباری اغراض کے لیے۔

---

[1] زراعت اور معدنی دولت کی زکوٰۃ کی شرح پانچ، دس اور بیس فی صد تک جا پہنچتی ہے۔

اصل اہمیت اس نظام کے ڈھانچہ کو نہیں حاصل ہے بلکہ اہم چیز اس کی رُوح ہے۔ اسلام اپنی تلقین و ترغیب، اپنے قوانین اور اپنے اجتماعی ضوابط کے ذریعہ جو معاشرہ برپا کرتا ہے وہ اس نظام کے ڈھانچہ اور اس کے طریقۂ نفاذ سے مزاجی مناسبت رکھتا ہے۔ وہ قوانین اور ترغیبات سے مِل کر تکمیل پاتا ہے۔ اس میں کفالتِ باہمی داخل سے بھی جنم لیتی ہے اور ضوابط کے ذریعہ بھی عمل میں آتی ہے۔ دونوں طریقے ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے اور ہم آہنگ ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اس حقیقت کا فہم اکثر دشوار ہوتا ہے جو دوسرے مادّی نظاموں کے زیر سایہ پروان چڑھے ہیں لیکن ہم مسلمان اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں اور اپنے ذوقِ ایمانی سے اس کا پتہ پا چکے ہیں۔ اگر وہ لوگ اپنی نحوست اور بدبختی سے اس ذوق سے محروم ہیں ــــ بدبخت ہے وہ انسانیت جس کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے ــــ تو ایسا ہوا کرے، اور انھیں اس خیر سے محروم رہنے دو جس کی خوش خبری اللہ نے ان لوگوں کو دی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔

"جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال بجالاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ اَدا کرتے ہیں۔"

یہ لوگ اجر و ثواب کے علاوہ اِس زندگی میں سکون و اطمینان سے بھی محروم رہیں گے، اور اس محرومی کی تمام تر ذمہ داری ان کی اپنی جہالت، جاہلیت، گمراہی اور حق دشمنی پر ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے محاصل

زکوٰۃ وہ واحد حق نہیں جو مال میں عاید ہوتا ہو

ایسا نظر آتا ہے کہ جو لوگ آج کل زکوٰۃ کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے

ہیں وہ اِس بات پر قریب قریب متفق ہو گئے ہیں کہ اسلام سرمایہ پر جو ٹیکس عاید کرتا ہے اس کی آخری حد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زکوٰۃ ہے۔ پیشہ ور علماء کے اس سازشی اجماع کا پردہ چاک کرنا بہت ضروری ہے۔ جس کا سہارا وہ لوگ بھی لیتے ہیں جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اس ترقی کے زمانہ میں اسلامی نظام پر عمل نہیں ممکن ہے۔

درحقیقت زکوٰۃ مال و دولت پر عاید کیے جانے والے ٹیکس کی ادنیٰ ترین شرح ہے اور یہ ان حالات کے لیے ہے جب کہ جماعت کو محاصلِ زکوٰۃ کے بعد مزید فنڈ کی ضرورت نہ پڑے۔ ایسے حالات میں جب کہ زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو اسلام کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس نے شریعتِ اسلامی کو نافذ کرنے والے صاحبِ امر کو سرمایہ پر ٹیکس لگانے کے وسیع اختیارات دیے ہیں۔ وہ سرمایہ میں سے اِس قدر طلب کر لینے کا مجاز ہے جس قدر کہ اصلاحِ حال کے لیے ضروری ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ:

ان فی المال حقاً سوی الزکوٰۃ (ترمذی)

"مال میں زکوٰۃ کے علاوہ حق بھی ہے"۔

اسلامی قانون سازی میں مصالح مرسلہ اور سدِّ ذرائع کے اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ان کے تحت ہر طرح کے سماجی مصالح کا حصول اور ہر طرح کی مضرتوں کا ازالہ ممکن ہے۔

ان اُصولوں کی وسعت سامنے لانے کے لیے ہم استاذ محمد ابو زہرہ پروفیسر قانونِ اسلامی، لاء کالج، قاہرہ یونیورسٹی، کی کتاب "الامام مالک" کے بعض اقتباسات پیش کریں گے۔

مصالح مرسلہ

"وہ مصالح جن کے (شرعاً) معتبر ہونے پر (کتاب و سنت کی) کوئی نص نہ دلالت کرتی ہو مرسلہ کہلاتے ہیں۔ یہ بات فقہاء کے

نزدیک مختلف فیہ ہے کہ ان مصالح کا اعتبار و لحاظ فقہ اسلامی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ نہیں۔ قرافی کا دعویٰ ہے کہ بلا استثناء تمام فقہاء نے جزئیات فقہ میں ان مصالح کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کو دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر نے انھیں ایک بنیادی اصول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ قرافی لکھتے ہیں:

"دوسرے مکاتبِ فکر کے لوگ مصلحت مرسلہ کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن اگر آپ غور کریں تو مسائل کی تفریع میں ان کو اکثر مطلق مصلحت کا اعتبار کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ ہر اس موقع پر جب کہ دو (ہم جنس) امور میں مختلف احکام تجویز کرتے یا دو (مختلف) امور کو ایک ہی حکم کے تحت قرار دیتے ہیں، خود کو اصولی دلائل دینے کا مکلّف نہیں سمجھتے بلکہ محض ادنیٰ مناسبت پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ ہم اسی کو مصلحت مرسلہ (پر اعتبار کرنا) کہتے ہیں۔"

قرافی کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط، یہ بات طے شدہ ہے کہ جن مصالح کے اعتبار کو کسی نص شرعی کی سند نہ حاصل ہو ان کو معتبر قرار دینے کے سلسلہ میں علماء مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ اگر ان کے اعتبار میں (عملاً) اختلاف نہ موجود ہو تو بھی، جیسا کہ قرافی کا بھی خیال ہے اس بارے میں ضرور اختلاف ہے کہ ان کا اعتبار کس حد تک کیا جائے۔

علماء کے درمیان اِس سلسلہ میں چار مختلف رائیں ملتی ہیں:

پہلی قسم شوافع اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی ہے، جن مصالح کے اعتبار کے لیے کوئی شرعی دلیل نہ موجود ہو انھیں یہ معتبر نہیں قرار دیتے۔ کیوں کہ یہ حضرات صرف منصوص اور قیاس المنصوص کے قائل ہیں۔ قیاس کے لیے ان کے یہاں یہ شرط ہے کہ اصل اور فرع کے درمیان

یعنی جو حکم مستنبط کیا جا رہا ہے اس کے اور منصوص حکم کے درمیان کوئی باقاعدہ اصولی رشتہ پایا جاتا ہو۔ قرافی ہمارا ساتھ دے سکے تو بہتر ہو، کیوں کہ ہم یہ کہتے ہیں کہ شوافع کے یہاں باقاعدہ قیاس کے بغیر کسی مصلحت مرسلہ کے اعتبار کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

دوسری رائے احناف اور ان دوسرے حضرات کی ہے جو قیاس کے ساتھ استحسان کے بھی قائل ہیں۔ استحسان کی یہ لوگ جو تعریف بھی کرتے ہوں اس میں مطلق مصلحت پر اعتماد کرنا آپ سے آپ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے استنباط میں مصالح کا اعتبار شوافع سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن خالص استحسان کی مثالیں ان کے یہاں بھی بہت زیادہ نہیں۔ کیوں کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں ان کا سہارا تمام تر صرف مصالح پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مصالح کو اُن کے یہاں بنیادی اصول کے طور پر نہیں شمار کیا جاتا۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مصالح کے اعتبار میں غُلو سے کام لیتے ہیں، یہاں تک کہ انسانی معاملات میں مصالح کو نص پر مقدم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصلحت نص کی تخصیص کر سکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک مصلحت اجماع کی بھی تخصیص کر سکتی ہے۔ اگر کسی نص کی روشنی میں کسی مسئلہ پر علماء کا اجماع ہو گیا ہو اور پھر یہ حکم بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مصلحت کے منافی نظر آئے تو مصلحت کے لحاظ کو مقدم رکھا جائے گا اور ایسا کرنے کو تخصیص سمجھا جائے گا۔ طوفی نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔

چوتھی قسم معتدل رائے رکھنے والوں کی ہے اور انہی کا مسلک اقرب الی الصواب نظر آتا ہے۔ ان کی رائے میں مصالح مرسلہ کا اعتبار ان امور میں کیا جائے گا جن میں نصِّ قطعی نہ وارد ہوئی ہو۔ مالکیہ میں

سے اکثر یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ مسلک کہ مصالح مرسلہ کا اعتبار ایک مستقل اصول قانون ہے امام مالکؒ کا خود اختراع کردہ نہیں بلکہ اس باب میں وہ (سلف صالح کے) متبع تھے (جیسا کہ ذیل کے نظائر سے واضح ہوتا ہے)۔

۱۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؐ کی وفات کے بعد کچھ ایسے اقدامات بھی کیے جو آپؐ کے عہد میں نہ کیے گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا نہ ہوا تھا۔ مگر جب انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ حفّاظِ قرآن کی موت کے بعد قرآن کو بھول نہ جایا جائے تو مصلحت متقاضی ہوئی کہ وہ جمع قرآن کا اہتمام کریں۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مرتدین کے خلاف جنگوں میں حفّاظِ قرآن یکے بعد دیگرے شہید ہوتے جا رہے ہیں تو آپ کو قرآن کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہوا اور آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قرآن کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے۔ سارے صحابہؓ نے آپ کی تجویز سے پورا پورا اتفاق کیا۔

۲۔ صحابۂ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شراب خوار کو اسّی کوڑوں کی سزا دینے پر اتفاق کر لیا۔ یہ فیصلہ بھی مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔ کیوں کہ انھوں نے دیکھا کہ شراب خواری فضول بکواس پر ابھارتی اور بالآخر افترا پردازی اور پاکیزہ شریف عورتوں پر تہمت طرازی پر منتج ہوتی ہے۔

۳۔ خلفاء راشدینؓ نے متفقہ طور پر صنّاعوں پر ضمان عاید کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ جو اشیا ان کاریگروں کو کام کے لیے دی جاتی تھیں وہ اصولاً امانت کی حیثیت رکھتی تھیں (اور امانت میں نقصان واقع ہو

جانے یا اس کے ضائع جانے کی شکل میں امانت دار سے تاوان نہیں
وصول کیا جا سکتا، لیکن عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ لوگوں میں صنّاعوں کی
بڑی طلب تھی - اگر ان صنّاعوں کو لوگوں کے سامان ضائع جانے یا ان
میں نقص واقع ہو جانے پر قابلِ تاوان نہ قرار دیا جاتا تو یہ لاپروائی برتتے
اور عوام کا نقصان ہوتا - ایسی شکل میں مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ان
پر ضمان عاید کی جائے - اسی بنا پر حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو ان سامانوں
کا ذمّہ دار اور دین دار قرار دینے کی بابت یہ فرمایا ہے کہ "اس کے
بغیر لوگوں کے مفادات کا تحفّظ نہیں ہو سکتا۔

۴ - حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دستور یہ تھا کہ جن
والیوں پر خیانت کا شبہ ہوتا ان کے مال میں سے نصف حصّہ بحقِ سرکار
ضبط کر لیتے - وجہ یہ تھی کہ جو اموال یہ لوگ اپنے منصبِ ولایت کے
اثر سے فائدہ اُٹھا کر کماتے تھے وہ ان کے اصل ذاتی مال کے ساتھ
مِل چکا ہوتا تھا - ظاہر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ بھی مصلحتِ مرسلہ کے
تحت آتا ہے - آپ نے یہ محسوس کیا کہ والیوں کی اصلاح اور ان کو
منصبِ ولایت کے رُعب داب سے بے جا فائدہ اُٹھا کر نیز دوسرے
ناجائز طریقوں سے مال و دولت کمانے سے روکنے کے لیے ایسا
کرنا ضروری ہے -

۵ - حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ آپ نے
ملاوٹ کرنے کی سزا کے طور پر ایک بار پانی ملا ہوا دودھ زمین پر بہا
دیا تھا - یہ اقدام بھی مصلحتِ عامّہ کے تحفّظ کے لیے تھا تاکہ تاجر عوام
کو دھوکہ دینے سے باز آجائیں -

۶ - آپ کے بارے میں منقول ہے کہ اگر کسی آدمی کے قتل میں
ایک پورا گروہ شریک ہو تو آپ پورے گروہ کے قتل کا فیصلہ کرتے

تھے کیوں کہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا اور اِس باب میں کوئی نص نہیں موجود تھی۔ مصلحت کا ثبوت یہ ہے کہ مقتول بے گناہ ہے اور اسے عمداً قتل کیا گیا ہے۔ ایسی شکل میں اس کے خون کا بدلہ نہ لینا اصولِ قصاص کی جڑ کاٹ دینے کے ہم معنیٰ ہو گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ قتل کرنے میں ایک دوسرے سے مدد لینے لگیں گے۔ کیوں کہ انھیں بخوبی معلوم ہو گا کہ مِل جُل کر یہ کام کیا جائے تو اُن سے قصاص نہیں لیا جا سکے گا۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس شکل میں جو قاتل نہیں اُسے قتل کی سزا دے کر دین میں ایک بدعت کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ مذکورہ بالا گروہ میں سے کسی ایک فرد کو بھی، اس کی انفرادی حیثیت میں، قاتل نہیں قرار دیا جا سکا۔ جواب یہ ہے کہ قتل کا اصل مجرم وہ پورا گروہ بحیثیت گروہ ہے۔ اسے بھی اُسی طرح قتل کیا جائے گا جیسے کہ کسی منفرد قاتل کو۔ اس گروہ کی طرف قتل کا جُرم اِسی طرح منسوب ہوا ہے جس طرح کہ وہ کسی فردِ واحد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا کہ اِس شکل میں یہ پورا گروہ سزائے قتل کے سلسلہ میں فردِ واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا کرنے کا محرک مصلحت ہے۔ کیوں کہ خوں ریزی کا سدِّ باب اور انسانی سماج کا تحفظ اِسی طرح ممکن ہے۔

مسائلِ عامہ میں مصلحت کے لحاظ کی ایک مثال یہ ہے کہ جب بیت المال خالی ہو، یا فوج کے اخراجات بڑھ جائیں اور بیت المال میں بقدرِ ضرورت فنڈ نہ موجود ہو تو امام کو چاہیے کہ مال داروں پر بقدرِ ضرورت ٹیکس عاید کر دے۔ جب تک بیت المال میں دوسری مدات سے کچھ آمدنی نہ ہو جائے یا اس میں ضروریات کے بقدر مال نہ آ جائے۔ یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ امام کو چاہیے کہ یہ ٹیکس فصل کٹنے اور پھلوں کے توڑے جانے کے وقت وصول کرے

تاکہ صرف اصحابِ ثروت سے مالیہ طلب کرنا ان میں بد دلی پیدا کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ اس میں مصلحت کا پہلو یہ ہے کہ امامِ عادل اگر ایسا نہیں کرتا تو اس کی دھاک اُکھڑ جائے گی، ہر طرف فتنے سر اٹھانے لگیں گے اور ان لوگوں کے غلبہ کا خطرہ قوی تر ہو جائے گا جو ایسے مواقع سے فائدہ اُٹھا کر اوپر آنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام کو ٹیکس لگانے کے بجائے بیت المال کی طرف سے قرض لے لینا چاہیے۔ شاطبی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ناگہانی اُمور پیش آجانے پر قرض لینا اسی شکل میں مناسب ہوگا جب کہ بیت المال کو مستقبل قریب میں کچھ آمدنی ہونے کی توقع ہو۔ ایسی شکل میں جب کہ کوئی آمدنی متوقع نہ ہو اور آمدنی کے جو ذرائع میسّر ہوں ان کی آمدنی بھی گر گئی ہو اور ضروریات کے لیے ناکافی ہو ٹیکس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ذرائع

ذریعہ کے معنیٰ ہیں وسیلہ کے۔ سدِّ ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ (ناپسندیدہ چیزوں کے) اسباب کا ازالہ کر دیا جائے۔ جو چیز کسی حرام کا سبب یا ذریعہ ہو وہ خود بھی حرام قرار پاتی ہے، اور جو چیز کسی واجب کا وسیلہ ہو وہ خود بھی واجب ہے۔ زنا حرام ہے۔ لہٰذا کسی اجنبی عورت کی طرف قصداً دیکھنا بھی حرام ہے۔ کیوں کہ یہ چیز زنا کی طرف لے جاتی ہے۔ جمعہ کی نماز فرض ہے، لہٰذا اس کے لیے جانا اور اس روانگی کی خاطر کاروبار روک دینا بھی فرض ہے۔ حج فرض ہے، لہٰذا بیت الحرام کی طرف سفر اور حج کے جملہ مراسم کو بجا لانا بھی فرض ہے۔

سدِّ ذرائع میں اصل اہمیت اِس بات کو حاصل ہے کہ کوئی کام بالآخر کس انجام تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس کا رُخ اُن مصالح کی جانب ہو جو باہمی معاملات سے متعلق اور ہر طرح مطلوب و مقصود ہوں تو خود

یہ کام بھی ان مقاصد کی اہمیت اور ضرورت کی مناسبت سے کم یا زیادہ مطلوب قرار پائیں گے۔ البتہ یہ کام (جو ذریعہ بن رہے ہیں) اپنی مطلوبیت میں اِن مقاصد کے ہم پلّہ نہیں۔ اگر یہ کام ایسے ہیں کہ ان کے انجام نامطلوب مفاسد ہوں تو یہ خود بھی انھیں مفاسد کی حُرمت کی مناسبت سے حرام قرار پائیں گے، اگرچہ اس شدت کے ساتھ نہیں جس شدّت کے ساتھ کہ خود یہ مفاسد حرام ہوں۔

اس سلسلہ میں اصل اہمیّت کام کرنے والے کی نیّت اور ارادے کو نہیں بلکہ اس کے کام کے اثرات و نتائج کو حاصل ہے۔ آخرت میں جزا و سزا کا مدار بلاشبہ کام کرنے والے کی نیّت اور ارادے پر ہے۔ لیکن کسی کام کو بھلا یا بُرا قرار دینے، یا اسے مطلوب یا ممنوع قرار دینے کا مدار تمام تر اس کے عملی نتیجہ پر ہے۔ دنیا کا نظام بندگانِ خدا کے مصالح کے تحفّظ، عدل و انصاف اور توازن پر مبنی ہے اور ان امور کا تقاضا ہے کہ حسنِ نیّت اور ارادۂ ثواب پر نہیں بلکہ کاموں کے عملی اثرات و نتائج پر نظر ڈالی جائے۔ جو شخص خالصۃً لوجہ اللہ بتوں کو گالیاں دے وہ اپنے تئیں مخلص ہو سکتا ہے، لیکن اگر اس کے اثر سے مشرکین غضب ناک ہو کر اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے لگیں تو اس شخص کو خود اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط (الانعام: ۱۰۸)

"یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔"

"جو چیز اس ممانعت کا باعث بنی وہ اس فعل کا عملی نتیجہ ہے۔
اس نیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جو اپنی جگہ خالصتہً مذہبی تھی اور جس کا مقصود حصولِ ثواب تھا۔ اِس سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جو چیز گناہ و فساد پر منتج ہوتی ہو اس کی ممانعت میں صرف خلوصِ نیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے عملی نتیجہ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور اسی بُرے نتیجہ کے سبب اُسے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اس کے مخلصانہ محرّک کا خوب علم ہوتا ہے۔

ایک آدمی کسی مباح کام کو کسی بُرے مقصد کا ذریعہ بناتا ہے ایسا آدمی خدا کے حضور گناہ گار قرار پائے گا لیکن کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کا حق نہیں اور اس کے اس طرح کے تصرّف کو شرعاً باطل نہیں قرار دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص اپنے مال کا نرخ بہت ارزاں کر دیتا ہے تاکہ اپنے کسی حریف تاجر کو نقصان پہنچا سکے، یہ بلاشبہ ایک مباح کام ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ ایک گناہ یعنی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بھی بن رہا ہے اور وہ بھی قصداً۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اِس فعل کو علی الاطلاق باطل نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ یہ ایسا کھلا ہوا فعلِ ممنوع ہے جسے عدالت کے ذریعہ روکا جا سکتا ہو۔ نیّت کے اعتبار سے یہ کام شر کا ذریعہ ہے اور ظاہر اطوار پر یہ خاص اور عام دونوں طرح کے فائدوں کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ جہاں تک اس تاجر کا سوال ہے اسے اپنی تجارت کے چمک اُٹھنے اور گاہکوں کی تعداد میں اضافہ سے یقیناً فائدہ ہوگا۔ عام لوگوں کو بھی ارزانی سے فائدہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے سبب عام نرخ بھی گر جائے۔

جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہو گیا ہو گا سدِّ ذرائع کا اُصول صرف انفرادی نیتوں اور مقاصد کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر عام لوگوں کے مفاد اور ان سے ضرر و فساد کے ازالہ پر بھی ہوتی ہے۔ یہ اصول ارادہ کے ساتھ عملی نتیجہ کا اور بسا اوقات صرف عملی نتیجہ کا لحاظ کرتا ہے۔

سدِّ ذرائع کا اصولِ قانون سازی ہونا قرآن و سنّت سے ثابت ہے۔ قرآن میں اللہ تعالےٰ کا یہ قول موجود ہے کہ:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍؕ

(الانعام: ۱۰۸)

"یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں"

روایت ہے کہ مشرکین نے مطالبہ کیا تھا کہ مسلمان ان کے خداؤں کو بُرا کہنے سے باز آجائیں ورنہ وہ ان کے خدا کو بُرا کہنے لگیں گے"

نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْاؕ (البقرہ: ۱۰۴)

"اے ایمان والو رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہو، اور توجہ سے بات کو سُنو"

مسلمانوں کا ارادہ نیک تھا لیکن یہود نے اِس لفظ (رَاعِنَا) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دینے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

سنت میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعدد فتاویٰ اس کی نظیریں ہیں۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے قتل سے اسی لیے احتراز کیا کہ کفار کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو مقروض سے ہدیہ قبول کرنے سے منع فرمایا ہے اِلّا یہ کہ وہ اِسے قرض میں سے وضع کردے۔ وجہ یہ ہے کہ ہدیہ دینے سے مقروض کی غرض یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اسے ادائے قرض میں تاخیر کا بہانہ بنائے۔ یہ کھُلا ہُوا سود ہوگا کیوں کہ قرض خواہ کا اصل تو اُسے پورا پورا واپس ملے گا اور جو کچھ تحفہ کے طور پر اسے دیا جائے وہ مزید ہوگا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ جنگ میں (چوری کی سزا کے طور پر) ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ یہ سزا، سزا یافتہ کے دشمن سے جا مِلنے کا باعث بن جائے۔ اِسی مصلحت کی بنا پر جنگ میں حدود نہیں نافذ کی جاتیں کہ مبادا سزا کی دہشت مجرم کو گمرہی میں نہ مبتلا کر دے، جس کا دروازہ حالتِ جنگ میں بالکل سامنے ہوتا ہے۔

مہاجرین وانصار میں سے سابقین اوّلین کا طریقہ یہ تھا کہ جس عورت کو اس کے شوہر نے مرضِ موت میں طلاق بائن دی ہو اُسے اس مرد کے ورثہ کا (بربنائے زوجیّت) مستحق قرار دیتے تھے۔ کیوں کہ مرد پر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اس نے عورت کو اس لیے طلاق دی کہ وہ ورثہ سے محروم ہو جائے۔ محروم کرنے کا ارادہ ثابت تو نہیں کیا جا سکتا۔ مگر طلاق عملاً اس کا ذریعہ بنتی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احتکار سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے:

مَنْ احتکر فھو خاطی (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

"جس نے احتکار کیا اس نے غلط کام کیا۔"

احتکار ضروریاتِ زندگی کا ذخیرہ کر کے لوگوں پر تنگی کرنے کا ذریعہ ہے اِسی لیے جس چیز کی ذخیرہ اندوزی عوام کے لیے تنگی کا باعث نہ ہو اس کا احتکار ممنوع نہیں۔ مثلاً سامانِ زینت و آرائش جنھیں ضروریات میں نہیں شمار کیا جاتا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے والے کو اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کے خریدنے سے منع کر دیا ہے خواہ وہ چیز عام بازار میں فروخت ہوتی ہوئی ملے۔ مقصود یہ ہے کہ کسی ذریعہ سے بھی اِس چیز کو واپس لینا ممکن نہ رہے جو اللہ کی راہ میں دی جا چکی ہو، خواہ یہ ذریعہ خریداری ہی کیوں نہ ہو۔ جب آپؐ نے بالعوض ایسی چیز کو واپس لینے سے روک دیا ہے تو بلا عوض واپس لینا بدرجہ اولیٰ ممنوع قرار پائے گا۔ صدقہ کی ہوئی چیز کو قیمت دے کر حاصل کر لینے کی اجازت دینے سے اِس بات کی گنجائش نکل آتی کہ کوئی کسی فقیر کے ساتھ حیلہ بازی کرے۔ وہ اسے ایک چیز صدقہ کے طور پر دے پھر اسے اصل قیمت سے کم پر خرید لے اور فقیر بے چارا یہ سمجھ کر کہ اسے کچھ نہ کچھ تو مِل ہی رہا ہے خوشی خوشی اسے کم داموں پر فروخت کر دے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ سے اِس طرح کے بکثرت نظائر منقول ہیں۔ علامہ ابنِ قیمؒ نے اِعلام الموقّعین میں تقریباً نوّے نظائر پیش کیے ہیں جن میں سدِّ ذرائع کی خاطر کسی چیز سے منع

کیا گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ آدھے اِسلامی قوانین سدِ ذرائع پر مبنی ہیں۔"

حاصل کلام یہ کہ مصالح مرسلہ اور سدِ ذرائع کے یہ دو اُصول ایسے ہیں کہ ان کو ان کے وسیع معانی کے ساتھ زیرِ عمل لایا جائے تو یہ حاکم کو ہر طرح کے اجتماعی مفاسد کے ازالہ کا اختیار مطلق عطا کرتے ہیں، خصوصاً جب کہ اس میں دولت پر ٹیکس لگانے کا اختیار شامل ہے۔ یہ اختیار اگر کسی قید کا پابند اور کسی شرط سے مشروط ہے تو صرف یہ کہ اُمت کے عام مفاد و مصالح کی رعایت ملحوظ رکھی جائے اور مکمل اجتماعی عدل کے قیام کو ہدف قرار دیا جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہے کہ اسلام میں انفرادی ملکیّت کا اُصول اِس بات میں مانع نہیں ثابت ہو گا کہ ریاست نفع یا خود سرمایہ میں سے ایک حصّہ وصول کرلے۔

شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے بنیادی اُصول کی پوری رعایت ملحوظ رکھی جائے۔ وہ اُصول یہ ہے کہ افراد کو ذاتی ملکیّت رکھنے کا حق حاصل رہے اور اس میں اضافہ کے شرعاً جائز طریقوں کے مطابق انھیں اس کے ثمرات حاصل ہوتے رہیں۔ نجی املاک میں سے محصول اسی حد تک وصول کیے جائیں جس حد تک پیش آمدہ ضرورت کا تقاضا ہو، اور ایسا طریقہ نہ اختیار کیا جائے کہ لوگ گھبرا اُٹھیں اور اُن میں پیداواری اعمال بجالانے اور دولت میں اضافہ چاہنے کا رجحان کمزور پڑ جائے...... اور ان باتوں سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ افراد کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان باقی رہے اور وہ ریاست کے ایسے غلام نہ بن جائیں جنھیں ڈر ہو کہ اگر اس پر تنقید کریں گے یا اس کی مخالفت کریں گے تو ان کی روزی بند کر دی جائے گی۔ کیوں کہ مسلمان پر — ہر مسلمان پر — یہ ذمّہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ حکمراں پر نگاہ رکھے اور اسے اللہ کی شریعت سے انحراف سے روکے۔ بھلا اس سے اس ذمّہ داری کی ادائیگی کس طرح بن پڑے گی اگر اس

کی اپنی روزی اپنے ہاتھوں میں نہ ہو، نہ اس کے پاس کوئی مال و املاک ہوں، بجز ان چیزوں کے جن کی ریاست اسے اجازت دے۔

یہ عجیب رسم چل پڑی ہے کہ سارا زور صرف زکوٰۃ پر صَرف کیا جائے۔ گویا اسلام میں مال کا حق صرف زکوٰۃ تک محدود ہے۔ ہمارا صاف صاف بیان اِس غلط رسم کا پردہ چاک کرنے اور ان پیشہ ور علماء کی حقیقت آشکارا کرنے کے لیے ضروری ہؤا جن کا کاروبار آیات کی سستے داموں تجارت کرنا ہے۔ یہ لوگ اپنے پیٹ جہنّم کی آگ سے بھر رہے ہیں۔

ان لوگوں کی مغالطہ انگیزی کو دفع کرنے کے لیے بھی یہ وضاحت ضروری تھی جو سماجی تحفّظ کی ان ضمانتوں کا درجہ گھٹا کر بیان کرتے ہیں جو اسلامی نظام میں فراہم کی گئی ہیں اور انھیں ناکافی قرار دے کر یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی نظام دَورِ حاضر کی زندگی کے تقاضے نہیں پورے کر سکتا۔ یہ ساری باتیں افترا انگیزی اور پروپیگنڈے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ ایسی باتیں کرنے والے اسلام کی حقیقت اور اسلامی نظامِ زندگی نیز اس کی عملی تاریخ سے یکسر ناواقف ہیں۔

اِس کتاب میں ہمارا موضوعِ بحث "اسلام کا اقتصادی نظام" نہیں ہے کہ ہم اِس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالیں۔ ہمارا موضوع اجتماعی عدل کے ضمن میں اِقتصادی پالیسی کا بیان ہے ...... اگرچہ اسلام نے زندگی کے لیے جو مکمّل نظام عطا کیا ہے اس کے ایک شعبہ کو دوسرے شعبہ سے الگ کرنا بڑا دشوار ہے۔ لیکن اس کتاب کے موضوع کی نوعیّت اسلام کے اقتصادی نظام کے بارے میں مزید تفصیلات کی متحمّل نہیں۔

چنانچہ ہم ذیل میں اِس نظام کے بنیادی اُصول اختصار کے ساتھ بیان کر دینے پر اکتفا کریں گے:

۱۔ یہ نظام "مشروط نیابت" پر مبنی ہے۔ زمین کے جملہ وسائل و املاک کا خالق و مالک اللہ سبحانہٗ ہے۔ اس نے نوعِ انسانی کو اس زمین میں اپنا نائب

مقرر فرمایا ہے ـــــ اِس شرط کے ساتھ کہ وہ اس ملکیت میں اللہ کی شریعت کے مطابق تصرف کرے۔ اِس شرط کی ہر خلاف ورزی تصرف کو کالعدم کر دیتی ہے اور نیابت کے معاہدہ کو ختم کر دیتی ہے۔

۲- یہ نیابت عام ہے۔ لیکن افراد کو ان کے "عمل" کے عوض انفرادی ملکیت کا حق حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ شارع یعنی اللہ سبحانہٗ، انھیں بعض متعیّن املاک کا مالک بنا دیتا ہے اور اس حق کو وہ عام تحفّظات عطا کرتا ہے جن کے نتیجہ میں فرد کو اپنی روزی کی طرف سے اطمینان ہو جائے اور وہ دلجمعی کے ساتھ باعزت طریقہ پر زندگی گزار سکے، تاکہ وہ شریعت الٰہی کے نفاذ کے سلسلہ میں نگرانی اور احتساب کی وہ ذمہ داری ادا کر سکے جو اس پر عائد کی گئی ہے۔

۳- انفرادی ملکیت اگرچہ اس نظام کا بنیادی اُصول ہے لیکن یہ حق حصولِ ملکیت، اس میں اضافہ چاہنے اور اس کے استعمال کے ضمن میں متعدد حدود و قیود کا پابند کیا گیا ہے، جن کا منشا فرد اور جماعت کے مصالح کا حصول اور دونوں میں سے کسی ایک کے حد سے تجاوز کر جانے کو روکنا ہے۔

۴- امتِ مسلمہ کی زندگی کا بنیادی طریقہ، انفرادی ملکیت کے اُصول کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے، کفالتِ باہمی ہے۔ انفرادی ملکیت پر عاید ہونے والی جن ذمہ داریوں کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے وہ اِسی اصول (کفالتِ باہمی) کا تقاضا ہیں اور انھیں شریعت نے واضح کر دیا ہے۔ کفالتِ باہمی پر عمل کے لیے شریعت کی عائد کردہ یہ ذمہ داریاں کافی ہیں۔

۵- اِس نظام کے ذریعہ اُس سے کہیں زیادہ اور بہتر اجتماعی عدل قائم ہوتا ہے جتنا انسان کے وضع کردہ کسی دوسرے نظام کے ذریعہ ممکن ہے جس میں صحیح اور غلط دونوں کی آمیزش ہو گی۔

طابع　اخلاق حسین، ڈائرکٹر

ناشر　اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مطبع　مسعود پرنٹرز ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور

اشاعت :

پہلی　اپریل ۱۹۶۹ء　۳،۰۰۰

قیمت :　۷۰ پیسے

ہماری تازہ مطبوعات

	اعلیٰ ایڈیشن	سستا ایڈیشن
۱۔ سلاجقہ از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	۵-۲۵ روپے	۳ روپے
۲۔ ضبطِ تولید کی شرعی حیثیت از مفتی محمد یوسف	۳-۷۵ ″	۱-۷۵ ″
۳۔ مولانا مودودی پر اعتراضات کا علمی جائزہ حصہ اوّل	۸-۰۰ ″	۲-۵۰ ″
۴۔ ″ ″ ″ ″ ″ حصہ دوم	۸-۰۰ ″	۲-۵۰ ″
۵۔ قرآنی تعلیمات حصہ اوّل از محمد یوسف اصلاحی	۶-۵۰ ″	۴-۰۰ ″
۶۔ ″ ″ ″ دوم ″ ″	۶-۵۰ ″	۳-۵۰ ″
۷۔ آدابِ زندگی ″ ″	۷-۵۰ ″	۵-۲۵ ″
۸۔ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) از محمد عنایت اللہ سبحانی اصلاحی	۶-۵۰ ″	۴-۵۰ ″
۹۔ آسان تفسیر از عبدالحیٔ	۸-۲۵ ″	
۱۰۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی از علامہ محمد راغب طباخ	۱۱-۲۵	۷-۰۰ ″
۱۱۔ اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار از خلیل حامدی		۰-۷۰ ″
۱۲۔ عالمِ اسلام اور اس کے افکار و مسائل ″ ″	۷-۰۰ ″	۵-۰۰ ″
۱۳۔ مکتوبات حضرت علیؓ از حکیم نبی احمد خاں رامپوری	۶-۵۰ ″	۳-۷۵ ″

اسلام کے معاشی نظام پر چند بلند پایہ کتب

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	اعلیٰ ایڈیشن	سستا ایڈیشن
۱- سود	۸/- روپے	۵.۰۰ روپے
۲- اسلام اور جدید معاشی نظریات	۳.۵۰ 〃	۱-۷۵ 〃
۳- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۰۰-۵۰ 〃	x 〃
۴- اسلام اور عدل اجتماعی	۰۰-۴۰ 〃	〃
۵- مسئلہ ملکیت زمین	۲-۲۵ 〃	۱-۵۰ روپیہ
۶- قرآن کی معاشی تعلیمات	۰-۵۰	
۷- اسلامی نظمِ معیشت کے اصول اور مقاصد		۰/۲۵ 〃
سید قطب شہیدؒ		
۱- اسلام میں عدلِ اجتماعی	۱۲-۵۰ 〃	۸-۵۰ 〃
ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی		
۱- اسلام کا نظریۂ ملکیت حصہ اول	۸-۵۰ 〃	۴-۵۰ 〃
۲- 〃 〃 〃 حصہ دوم	۷-۵۰ 〃	۴-۵۰ 〃
۳- اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ کتاب الخراج)	۱۲-۵۰ 〃	۸-۰۰ 〃